چوبیس آنکھیں

ساکائے سُوبوئی

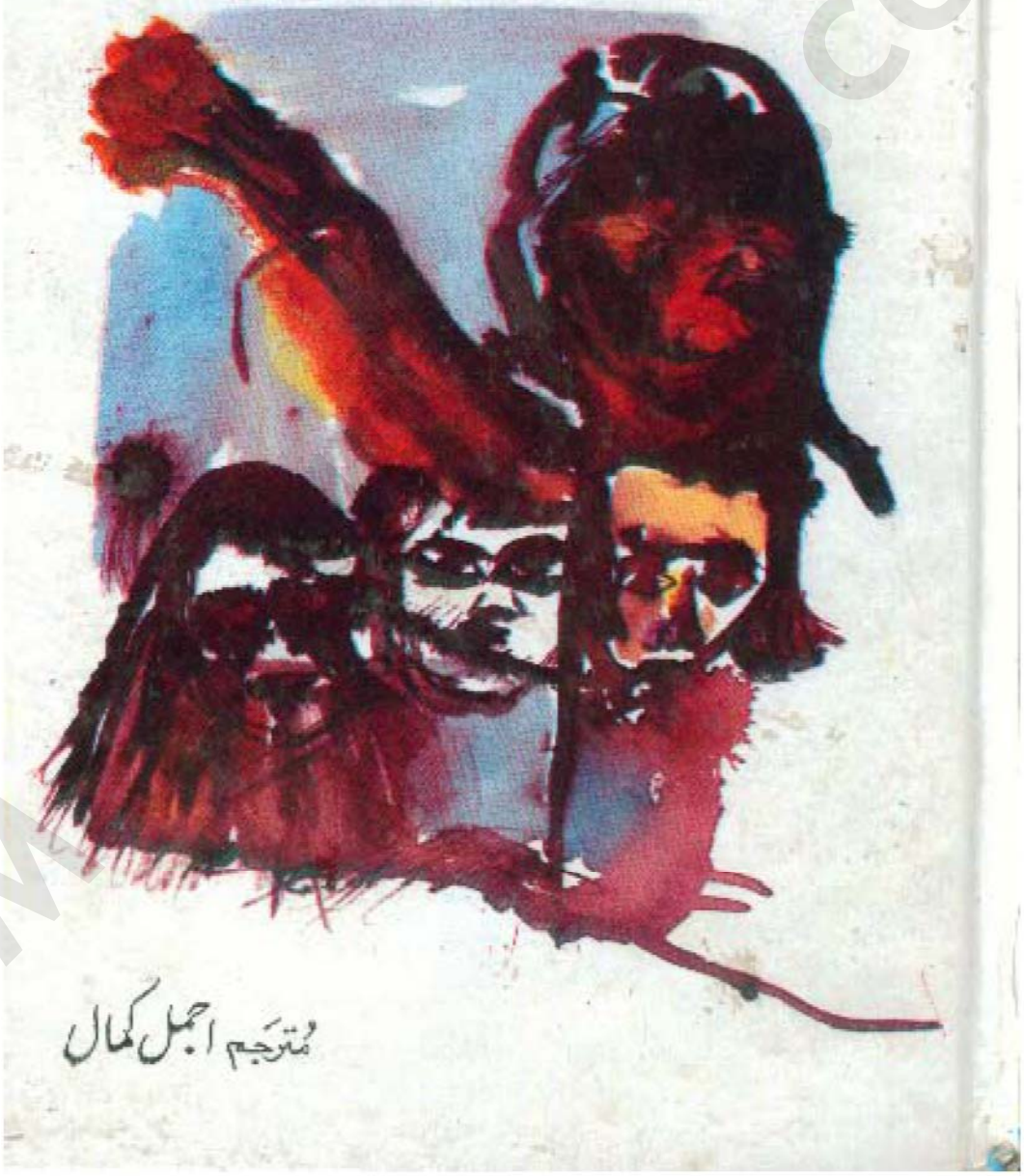

مترجم اجمل کمال

چوبیس آنکھیں

ساکائے سُوبوئی

مترجم: اجمل کمال

مشعل

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.com

مصنفہ کا تعارف

جاپانی ناول ''چوبیں آنکھیں'' کی مصنفہ ساکائی سوبُوئی (Sakae Tsuboi) ۱۹۰۰ء میں خشکی سے گھرے سمندر سیتو کے جزیرہ شَودو میں پیدا ہوئیں۔ گریڈ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے جزیرے کے ڈاک گھر اور دیہی مرکز میں کلرک کے طور پر دس برس کام کیا۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ٹوکیو منتقل ہوگئیں جہاں شاعر شیگے جی سوبوئی سے ان کی شادی ہوئی۔ وہیں بعد میں وہ جاپانی ناول نگار خواتین، مثلاً یوریکو میاموتو اور اینکو ساتا سے متعارف ہوئیں اور ان کی حوصلہ افزائی کے زیر اثر فکشن میں طبع آزمائی شروع کی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ان کے ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ سوبوئی ایسی کہانیاں سنانے میں خاص مہارت رکھتی ہیں جن کے مرکزی کردار بچے ہوں۔ اس قسم کی کئی تحریروں پر انھیں مختلف اعزاز بھی مل چکے ہیں۔

سوبوئی کا زیر نظر ناول ''چوبیں آنکھیں'' پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اور چھپتے ہے مقبول عام ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے بعد فلم ڈائریکٹر کیسو کے کیسنو شیتا نے اس ناول پر ایک فلم بنائی جس کا ہر عمر کے ناظرین نے پُر جوش خیر مقدم کیا۔

MashalBooks.com

پیش لفظ

کسی دانا نے امن اور جنگ کا فرق یوں بیان کیا تھا کہ امن کے دنوں میں اپنی طبعی عمر گزار کر مرنے والے باپوں کو اُن کے بیٹے گورستان تک پہنچاتے ہیں جب کہ جنگ کے زمانے میں بوڑھے باپوں کو اپنے جوان بیٹوں کو میّتوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ انسانوں کے دو گروہوں کے درمیان ہونے والی ہر جنگ نہایت بلند آہنگ قومی اور نظریاتی مقاصد کے دل فریب نعروں کے جلوس میں وارد ہوتی ہے اور ان نعروں کی گونج میں یہ سادہ انسانی حقیقت نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ جنگ کا مطلب دونوں طرف کے جوانوں کو زندگی کے امکانات سے محروم کر کے، طبعی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے، موت سے ہم کنار کر دینا ہے۔ جنگ کی بابت جو بنیادی انسانی سوال بار بار اٹھاتے رہنا چاہیے وہ یہ ہے: کیا کوئی قومی یا نظریاتی مقصد اس لائق ہے کہ نوعمر انسانی زندگیوں کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جائے؟

جاپانی خاتون ناول نگار ساکائے سوبوئی (Sakae Tsuboi) نے اپنے ناول ''چوبیس آنکھیں'' میں یہی بنیادی سوال اٹھایا ہے۔ اس ناول کے ایک پُر اثر منظر کا نقش پڑھنے والے کے دل پر بیٹھ جاتا ہے: بندرگاہ پر بنی آرائشی محراب جس کے ایک جانب ''الوادع'' اور دوسری جانب ''خوش آمدید'' کے الفاظ تحریر ہیں اور جہاں زندہ نوعمر انسانوں کو نعروں کی گونج میں بھیجا اور اُن کے مُردہ جسموں کو انھیں نعروں کی گونج میں وصول کیا جاتا ہے۔ رفیع نظریاتی مقاصد اور بلند بانگ قومی دعووں کی دھند درمیان سے ہٹا دیجیے تو جنگ کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے؟

سوبوئی کا یہ ناول، جیسا کہ اس کے انگریزی مترجم آکیرا میورا (Akira

(Miura کا کہنا ہے، ان عمیق سوالوں سے سروکار رکھتا کہ ''جنگ کیوں ہوتی ہے؟''، ''جنگ کو کیوں کر روکا جا سکتا ہے؟'' اور ''کیا تمام جنگیں بے جواز ہوتی ہیں؟'' یہ سوالات بلاشبہ کسی تخلیقی یا علمی مطالعے کا موضوع بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن سوبوئی نے اپنے ناول میں ایک استانی کی دردمندی سے بارہ کم سن شاگردوں کی زندگی کا مطالعہ کر کے صرف یہ دیکھنا اور دکھانا چاہا ہے کہ جنگ کی مہیب اور غیر انسانی وحشت نے ان انسانی وجودوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ عمیق سوالوں کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان سے اس انسان دوست تخلیقی مطالعے کی اہمیت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔

نوخیز نسل کا رُخ زندگی کی نیرنگیوں سے موڑ کر اسے جنگ کا ایندھن بننے پر آمادہ کرنے کا عمل ایک سفّاک اور بے درد منصوبہ بندی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتا۔ اس ناول میں اس منصوبہ بندی کی جھلک بڑی خوبی سے اُبھرتی ہے جس کے تحت معصوم ذہنوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قومی تاخیر کی فتح مندی پھولوں، تتلیوں اور انسانی رشتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ چوں کہ ہر جنگ اپنے بنیادی مفہوم، یعنی انسانوں کے قتل، میں دراصل فطرت کے خلاف جنگ ہے، اس لیے جنگی جنون پیدا کرنے والے پروپیگنڈے کا ایک ناگزیر پہلو حقائق کی پردہ پوشی بھی ہوتا ہے۔ حقائق کی روشنی سے محروم ہو کر یہ نوخیز ذہن اس مطلوبہ حالت کو پہنچ جاتے ہیں کہ انھیں تعصّب اور نفرت کی دھند میں لپیٹ کر ماؤف کیا جا سکے اور وہ اپنے نوجوان جسموں کو جنگ کی آگ کے سپرد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

اس ناول کے واقعات دوسری جنگِ عظیم سے قبل، دوران اور بعد کے تاریخی حقائق کے پسِ منظر میں رونما ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کا سیاق وسباق ۴۰-۱۹۳۰ کی دہائیوں کا جاپان ہے۔ لیکن اس ناول کی کامیابی یہ ہے کہ یہ اپنے فوری سیاق وسباق کا اسیر نہیں رہتا بلکہ اس میں بیان کی گئی انسانی سچائیوں کو ہم اپنے اردگرد بھی، اور آج بھی، دریافت کر سکتے ہیں۔ یہی اس کے اردو ترجمے کی اشاعت کا جواز ہے۔

اجمل کمال
کراچی
۲۵ جولائی ۱۹۹۵

MashalBooks.com

مس اوئیشی کے بارہ شاگردوں کے نام

لڑکیاں

کوتسوروکا بے: ''گھنٹی والے'' کی باتونی بیٹی۔

ماسونوکا تاگیری: ریستوراں کے مالک کی بیٹی جو موسیقی کا ذوق اور صلاحیت رکھتی تھی

کُوتولے کا تاگیری: ایک ماہی گیر کی بیٹی۔

ماتسوائے (ماتچان) کاوا موتو: بڑھئی کی بیٹی۔

فوجیکو کیسنو شیتا: ایک قدیم معزز گھرانے کی بیٹی۔

میساکو (مائیسان) نیشی گوچی: ایک خوش حال گھرانے کی بیٹی۔

سانائے یاماایشی: ایک شرمیلی مگر ذہین لڑکی۔

MashalBooks.com

لڑکے

نیتا آئزاوا: اونچی آواز والا ایک باتونی لڑکا۔

ایسوکیچی (سونکی) اوکادا: دہی پھلیاں بیچنے والے کا لڑکا۔

تاداشی (تانکو) موری اوکا: ماہی گیروں کے سردار کا بیٹا۔

تاکے ایچی تاکے شِیتا: چاول کے تاجر کا ذہین بیٹا۔

کیچی جی (کِچن) توکودا: ایک خاموش طبع لڑکا۔

MashalBooks.com

مس کوئیشی

اگر، جیسا کہ کہا جاتا ہے، ایک پیڑھی کی عمر بیس سال ہوتی ہے، تو اس کہانی کی ابتدا ایک پیڑھی سے کچھ زیادہ پُرانی ہے۔ اُس زمانے کے یادگار واقعات کا ذکر کیا جائے تو وہ یہ تھے کہ انتخابی نظام نیا نیا تبدیل ہوا تھا، اور ہر ایک کو ووٹ کا حق دینے والے نئے قانون کے تحت پہلے انتخابات فروری میں ہوئے تھے۔ ان انتخابات کے دو مہینے بعد، اپریل ۱۹۲۸ کی چار تاریخ کو، خشکی سے گھرے سمندر کے پاس واقع کسانوں اور ماہی گیروں کے ایک معمولی سے گاؤں میں ایک نوجوان عورت اسکول میں استانی ہو کر پہنچی۔

گاؤں میں سو سے کچھ اوپر گھر آباد تھے اور وہ ایک لمبی سی پتلی راس کی بالکل نوک پر واقع تھا؛ خشکی کی اس نوک دار پٹی کی وجہ سے کھاڑی کچھ کچھ جھیل جیسی لگتی تھی۔ چنانچہ گاؤں والوں کو کھاڑی کے دوسری طرف واقع کسی قصبے یا گاؤں میں جانا ہوتا تو یا تو چپوؤں والی کشتی کھے کر جاتے یا پہاڑی پگڈنڈیوں میں سے پیدل لمبا فاصلہ طے کر کے جانا پڑتا۔

چوں کہ گاؤں اس قدر دور اُفتادہ تھا اس لیے وہاں کے پرائمری اسکول جانے والے بچے پہلی چار کلاسیں اِسی گاؤں کے اسکول میں پڑھتے جو دراصل ایک اسکول کی ذیلی شاخ تھی۔ پانچویں میں پہنچنے پر انھیں تین میل دور بڑے گاؤں کے اسکول میں جانے کی اجازت ملتی۔ اُن کی ہاتھ کی بنی تنکوں کی چپلیں دن بھر کے چلنے پھرنے سے برابر ہو جاتیں لیکن بچوں کو اس بات پر ناز ہوتا۔ ہر صبح چپلوں کی نئی جوڑی پانے پر انھیں کیسی خوشی ہوتی ہوگی! پانچویں تک پہنچتے پہنچتے وہ خود بھی تنکوں کی چپلیں بنانا سیکھ چکے ہوتے تھے۔ ہر اتوار کو چپلیں بنانے کے لیے گھروں سے تنکے جمع کرنے کا الگ مزہ تھا۔ ان بڑے بچوں کو رشک سے تکتے تکتے چھوٹی عمر کے بچے، کسی شاگردی کے بغیر ہی، خود بخود یہ ہنر سیکھ جاتے۔ چھوٹے بچوں کے لیے پانچویں تک پہنچ جانے کا مطلب تھا اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانا۔ مگر اس کے باوجود، گاؤں کے اپنے اسکول کی زندگی بھی مزے سے خالی نہ تھی۔

MashalBooks.com

ذیلی اسکول میں دو پڑھانے والے ہمیشہ موجود ہوتے تھے: ایک سن رسیدہ استاد اور ایک نوجوان استانی۔ اس معمول میں بہت طویل عرصے سے فرق نہیں آیا تھا، جیسے یہ کوئی طے شدہ ضابطہ ہو۔ معمر استاد رات کو سٹاف روم کے برابر والے کمرے میں رہتا جب کہ نوجوان استانی روز صبح لمبا راستہ طے کر کے اسکول پہنچا کرتی۔ استاد تیسری اور چوتھی کلاس کو پڑھاتا، استانی پہلی اور دوسری کو۔ یہ سب مدتوں سے اسی طرح چلا آ رہا تھا۔ بچے ان دونوں کو نام سے نہیں بلکہ ماسٹر صاحب اور استانی صاحبہ کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ معمر استاد، ریٹائر ہو کر پنشن پانے کی امید میں، ٹکے رہتے تھے مگر نوجوان استانیاں سال بھر میں، یا بہت سے بہت دو سال میں، رخصت ہو جاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ راس کے گاؤں کا ذیلی اسکول ایک ایسا مقام ہے جہاں عمر رسیدہ استاد، جنھیں پرنسپلی کے عہدے تک پہنچنے کی امید نہ رہی ہو، اپنی ملازمت کے باقی ماندہ ایّام گزارتے ہیں، اور نئی، ناتجربہ کار استانیاں تدریس کا پہلا، دشوار تجربہ حاصل کرتی ہیں۔

آیئے، اب اپریل ۱۹۲۸ کی چار تاریخ پر واپس چلتے ہیں۔ اس روز، صبح سویرے،، گاؤں کے پانچویں اور اس سے اوپر کی کلاسوں کے بچے خوشی خوشی اپنے تین میل لمبے سفر پر بڑھ جا رہے تھے۔ وہ سب اونچی کلاسوں میں پہنچ جانے پر اتنے خوش تھے کہ ان کے قدم زمین پر ہلکے پڑ رہے تھے۔ ان کے بستوں میں نئی کتابیں رکھی تھیں اور نئی کلاسوں میں نئے استادوں سے پڑھنے کی امید میں انھیں یوں لگتا تھا جیسے وہ نئے راستوں پر چل رہے ہوں۔ اس کے علاوہ آج اسی راستے پر ان کی ملاقات نئی استانی سے ہونے والی تھی جو گاؤں کے اسکول میں پہلی بار پڑھانے آ رہی تھی۔

''کیسی چھوکری ہو گی نئی استانی؟'' بڑے اسکول کے لڑکوں میں سے ایک نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ قریب قریب اتنی عمر کا ہو گا جیسے آج کل کے جونیر ہائی اسکول کے لڑے ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بدتمیزی کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔

''کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ نئی والی ابھی ابھی گرلز ہائی اسکول سے نکلی ہے۔''

''پھر تو بالکل کچی ہو گی، کیوں؟''

''ہاں، ہمارے گاؤں میں تو کچی استانیاں ہی آتی ہیں۔''

''چھوٹے گاؤں میں تو اسی طرح گزارا کرنا پڑتا ہے۔''

گرلز اسکول سے نکلی استانیوں کو، جنھوں نے باقاعدہ ٹیچرز کالج کا منہ نہ دیکھا

ہو، گاؤں کے منہ پھٹ لوگ کچی استانیاں کہا کرتے تھے۔ آج کل کی زبان میں انھیں شاید اسسٹنٹ ٹیچر کہا جائے گا۔ یہ لڑکے اُنھیں منہ پھٹ بڑوں کی زبان میں باتیں کر کے خود کو بڑا محسوس کر رہے تھے۔ البتہ ان میں سے جو تازہ تازہ پانچویں میں پہنچے تھے اور آج پہلی بار بڑے اسکول جا رہے تھے، حیرت سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر چپ چاپ سن رہے تھے، جیسا کہ ٹولی میں نئے شامل ہونے والوں کا قاعدہ ہے۔ مگر جب گاؤں کی طرف آتی ہوئی شبیہ دکھائی دی تو اِنھیں پانچویں کلاس والوں نے سب سے پہلے مسرت کی چیخیں بلند کیں۔

''ہرّا! استانی صاحبہ آ گئیں!''

یہ مس کوبایاشی تھیں جو ابھی کچھ دن پہلے تک گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ عموماً وہ پاس سے گزرتے بچوں کے آداب کا جواب رکے بغیر ذرا سا سر ہلا کر دیا کرتی تھیں لیکن آج رک گئیں اور ایک ایک کے چہرے کو شفقت سے دیکھنے لگیں۔

''آج واقعی آخری دن ہے۔ آج کے بعد شاید ہم اس راستے پر نہیں ملیں گے۔ مجھے امید ہے تم لوگ اچھے شاگرد ثابت ہو گے۔''

ٹولی میں شامل کچھ لڑکیوں کا دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ مس کوبایاشی ایک استانی کی جگہ عارضی طور پر آئی تھیں جو بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑ گئی تھی۔ لیکن پہلے کی تمام استانیوں کے برعکس وہ گاؤں کے اسکول میں پورے ساڑھے تین برس ٹھہریں۔ اس طرح آج راستے میں جن بچوں سے اُن کی ملاقات ہوئی وہ سب کے سب ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ قاعدے کی رو سے اسکول کے عملے میں کسی تبدیلی کا اعلان نئے سال کے پہلے دن کیا جاتا تھا، مگر مس کوبایاشی نے روایت سے روگردانی کرتے ہوئے یہ خبر اپنے شاگردوں کو دس دن پہلے ہی دے دی تھی۔ ۲۵ مارچ کو، بڑے اسکول میں چھٹیاں شروع ہونے کی تقریب سے لوٹتے ہوئے وہ سب ان سے اسی جگہ ملے تھے جہاں آج کھڑے تھے۔ مس کوبایاشی نے ان سب کو الوداع کہا تھا اور ہر ایک کو بھوری مٹھائیوں کا ایک ایک ڈبّا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب آج نئی استانی کی آمد کے منتظر تھے۔ انھیں حیرت ہوئی کہ نئی استانی کے بجائے ان کی ملاقات پہلے مس کوبایاشی سے ہو گئی۔ شاید وہ آج گاؤں کے اسکول میں پڑھنے والے بچوں کو الوداع کہنے جا رہی ہوں گی۔

''مس کوبایاشی، نئی استانی کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے بس آتی ہی ہوں گی۔''

''کیسی ہیں وہ؟''

''مجھے تو پتا نہیں''

''وہی ہائی اسکول پاس ہوں گی؟''

''مجھے واقعی کچھ پتا نہیں۔ بہرحال، تم لوگ ان کو ستانا مت!'' مس کوبایاشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ملازمت کے پہلے سال میں برے اسکول کے بچے اُنھیں بھی بہت تنگ کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ رو پڑتی تھیں، کبھی کبھی تو بچوں کے سامنے ہی۔ مگر انھیں ستانے والوں میں سے کوئی آج کی ٹولی میں شامل نہیں تھا؛ وہ سب اِن بچوں کے بڑے بھائی بہن تھے۔ راس میں آنے والی اکثر استانیوں کو ایک نہ ایک موقعے پر تو رونا ہی پڑتا تھا کیوں کہ وہ سب نوعمر اور ناتجربہ کار ہوتی تھیں، اور یہاں کے بچے اس روایت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ نئی استانی کے بارے میں جاننے کو اس لیے بھی بے چین تھے کہ مس کوبایاشی گاؤں کے اسکول میں اتنے لمبے عرصے تک ٹھہری تھیں۔ ان سے رخصت ہونے کے بعد بچے اپنی اسکیمیں طے کرنے لگے اور تمام وقت ان کی نظریں سامنے کی طرف جمی رہیں جہاں سے وہ کسی بھی لمحے آتی ہوئی نئی استانی کو دیکھنے والے تھے۔

''آلووالی، آلووالی پکاریں تو کیسا رہے؟''

''اور جو آلووالی ہوئی تو؟''

''ہوگی تو آلووالی ہی!''

ملک کے اس خطے میں میٹھے آلو بڑی کثرت سے اگائے جاتے تھے، اور میٹھے آلو کے کھیتوں کے بیچوں بیچ لڑکیوں کا اسکول تھا۔ مس کوبایاشی خود اس اسکول کی پڑی ہوئی تھیں، اور بچوں نے گویا پہلے سے طے کرلیا تھا کہ نئی آنے والی بھی اسی اسکول کی ہوگی۔ ہر موڑ پر وہ گردنیں اٹھا اٹھا کر اُسے دیکھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کی جھلک تک پائے بغیر وہ سب ضلعے کی بڑی سڑک تک پہنچ گئے جو بڑے گاؤں کو جاتی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی، لمحے بھر میں، وہ استانی کو بھول بھال کر سڑک پر دوڑنے لگے کیوں کہ سڑک کے کنارے والی سرائے کا گھنٹا، جس پر وہ یہاں پہنچ کر ایک نظر ضرور ڈالتے تھے، انھیں بتا رہا تھا کہ دس منٹ آگے ہوگیا ہو؛ درآصل اُنھیں مس کوبایاشی سے باتیں کرنے میں دیر ہوگئی تھی۔ وہ بے تحاشا دوڑتے ہوئے خوب گرد اُڑا رہے تھے اور اُن کے بستے یا تو پیٹھ پر جھول رہے تھے یا بغل میں دبے ہوئے تھے۔

MashalBooks.com

اُنھیں نئی استانی کا خیال دوبارہ اُس وقت آیا جب وہ سہ پہر کو اسکول سے گاؤں واپس آتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں راس کو جانے والا راستہ بڑی سڑک سے الگ ہوتا تھا۔ وہاں انھوں نے ایک بار پھر مس کوبایاشی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مس کوبایاشی، لمبی آستینوں والا کیمونو پہنے، اپنے بازوؤں کو کچھ عجیب سے انداز میں ہلاتی آ رہی تھیں جس سے ان کی آستینیں پھپھٹا رہی تھی۔

''استانی!''

''استانی صاحبہ!''

ساری لڑکیاں اُن کی طرف بھاگنے لگیں۔ جوں جوں مس کوبایاشی کا مسکراتا ہوا چہرہ قریب آیا، بچوں کو اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کوئی نظر نہ آنے والی رسی کھینچنے کا سوانگ بھر رہی ہیں، اور وہ سب، ہنسنے لگے۔ وہ باری باری ایک ایک بازو کو گردش دیتیں جیسے سچ مچ رسی کو سونت رہی ہوں۔ پھر وہ رک گئیں اور ان سب کو اپنے پاس بلانے لگیں۔

''مس کوبایاشی، نئی استانی آئیں؟''

''ہاں، آگئیں۔ کیوں؟''

''اچھا، یہ بات ہے! یہی بات ہے نا؟ آج وہ کشتی میں آئی ہیں؟''

''کشتی میں؟ اور واپس بھی کشتی میں گئیں؟''

''ہاں۔ انھوں نے مجھ سے بھی کشتی میں چلنے کو کہا تھا مگر میں نے کہا، نہیں۔ میں تم لوگوں سے ایک بار پھر ملنا چاہتی تھی۔''

''واہ وا! واہ وا!''

لڑکیاں نعرے لگانے لگیں اور لڑکے مسکرا کر انھیں تکنے لگے۔ پھر ایک لڑکے نے پوچھا: ''کیسی استانی ہیں وہ؟''

''بہت اچھی استانی لگتی ہیں۔ اور ہیں بھی بہت پیاری،'' مس کوبایاشی جواب میں بولیں، جیسے انہیں یہ بعد والی بات ابھی ابھی اچانک یاد آئی ہو۔

''آلو والی ہیں نا؟''

''نہیں نہیں، آلو والی نہیں۔ اس سے بہت اچھی۔''

''مگر ہیں تو نئی، ہے نا؟''

اچانک مس کوبایاشی برہم دکھائی دینے لگیں اور بولیں:

MashalBooks.com

''ایسا کیوں کہتے ہو؟ وہ تمھیں تو نہیں پڑھائیں گی۔ اور پھر ایسی کون سی استانی ہوگی جو شروع شروع میں نئی نہ ہو؟ کیا تم اُنھیں بھی میری طرح رُلانا چاہتے ہو؟''

ان کے ایسا کہنے پر کچھ بچے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگ، جیسے مس کوبایاشی نے ان کا ارادہ ٹھیک ٹھیک بھانپ لیا ہو۔ ذیلی اسکول میں تعینات ہو کر آنے پر مس کوبایاشی کو بڑی عمر کے شاگرد طرح طرح سے ستاتے تھے۔ کبھی وہ قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور طنزیہ انداز میں جھک جھک کر آداب کرتے، کبھی ''آلو والی' آلو والی'' کے آوازے کستے، اور کبھی صرف ٹکٹکی لگا کر اُنھیں گھورا کرتے یا بتیسی نکالتے۔ مگر ساڑھے تین برس کی مدّت میں وہ ان حرکتوں کی عادی ہوگئی تھیں اور ان کا کوئی اثر نہ لیتی تھیں۔ بلکہ اب تو وہ خود کبھی کبھی اُنھیں چھیڑا کرتیں۔ آخر انھیں بھی تو تین میل کا راستہ طے کرنے میں کچھ نہ کچھ تفریح چاہیے تھی۔

کچھ وقفے کے بعد ایک اَور شاگرد نے پوچھا:

''نام کیا ہے نئی استانی کا؟''

''مس اوئیشی۔ مگر وہ بہت چھوٹی سی ہے۔ میں پھر لمبی ہوں، حالاں کہ کوبایاشی کہلاتی ہوں۔ مگر وہ تو سچ مچ بالکل ذرا سی ہیں۔ مشکل سے میرے کندھوں تک آتی ہوں گی۔''

''اچھا؟''

جب بچے ہنستے ہوئے خوش دکھائی دینے لگے تو مس کوبایاشی پھر سنجیدہ ہوگئیں۔

''مگر انھوں نے ہم سے کہیں زیادہ اچھی تعلیم پائی ہے۔ میری طرح آدھی تربیت یافتہ نہیں ہیں۔''

''واقعی؟ اور آتی بھی کشتی میں ہیں؟'' ایک بچے نے پوچھا جس کے لیے ظاہر ہے یہ کافی سنگین مسئلہ تھا۔ مس کوبایاشی نے اس کی فکرمندی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا:

''نہیں، صرف آج کشتی میں آئی تھیں۔ کل سے تمھاری اُن سے ملاقات ہوا کرے گی۔ مگر تم انھیں رُلا نہیں سکو گے۔ میں نے انھیں پہلے ہی خبردار کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اسکول آتے اور واپس جاتے ہوئے بڑے اسکول کے بچے ملا کریں گے۔ اگر وہ کوئی شرارت کریں تو کوئی دھیان نہ دینا۔ سمجھنا بندر اُچھل پھاند کر رہے ہیں۔

اگر وہ آوازیں نکالیں تو یہ ظاہر کرنا جیسے کوے کائیں کائیں کر رہے ہوں۔

MashalBooks.com

''اف خدایا!''

''ہائے ہائے!''

وہ سب زور زور سے ہنسنے لگے اور مس کو بایاشی بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئیں۔ پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہوے، مگر بچے انھیں باری باری اس وقت تک آوازیں دیتے رہے جب تک وہ اگلے موڑ پر نظروں سے اوجھل نہ ہوگئیں۔

''مس کو بایاشی!''

''خدا حافظ!''

''ہونے والی دُلھن!''

''خدا حافظ!''

بچوں کو معلوم تھا کہ مس کو بایاشی نے اسی لیے استعفٰی دیا ہے کہ ان کی شادی ہونے والی ہے۔ جب انھوں نے مڑ کر آخری بار ہاتھ ہلایا تو، جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے، ان سب کے دل میں عجیب سا احساس رہ گیا۔ وہ دن بھر کی مشغولیت سے تھکے ہوئے بھی تھے، اس لے بھاری قدموں سے گاؤں کی طرف چلنے لگے۔ وہاں پہنچنے پر انھوں نے گاؤں بھر کو ایک سنسنی میں گرفتار پایا۔

''نئی استانی نے مغربی لباس پہن رکھا تھا!''

''وہ آلو والے اسکول کی پڑھی ہوئی نہیں ہے!''

''اتنی چھوٹی سی ہے!''

اگلے دن بچے بڑے جوش و خروش سے اس چھوٹی سی استانی کو چونکانے کی ترکیبیں سوچنے لگے جو آلو والے اسکول کی پڑھی ہوئی نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے، اسکول کی طرف چلے جا رہے تھے۔ پھر اچانک انھیں حیرت نے آلیا۔ جگہ بھی کچھ ایسی ہی تھی، موڑ کے پاس جہاں سے دوسری طرف کا راستہ نظروں سے اوجھل رہتا تھا۔ ایک سائیکل موڑ کاٹ کر ایک دم ان کے سامنے آ گئی۔ سائیکل اس راستے پر شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی تھی۔ ان کے سنبھل کر دیکھ پانے سے پہلے ہی وہ سائیکل کسی پرندے کی طرح ہوا میں تیر کر ان کے بالکل پاس پہنچ گئی۔ اسے ایک نوعمر عورت چلا رہی تھی جس نے مغربی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ انھیں دیکھ کر مسکرائی، بولی: ''صبح بخیر!'' اور آن کی آن میں ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔

MashalBooks.com

یہی نئی استانی ہوگی۔ وہ اسے پیدل اپنی طرف قدم بڑھاتا دیکھنے کی توقع کر رہے تھے اور وہ سائیکل پر سوار شائیں سے ان کے پاس سے نکل گئی۔ پھر انھوں نے کسی استانی کو اسکول کے پہلے دن خود سے مخاطب ہو کر ''صبح بخیر'' کہتے بھی نہ سنا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے رہ گئے۔ ایسی نئی استانی انھوں نے یقیناً اس سے پہلے نہ دیکھی تھی۔ وہ جان گئے کہ چھوٹی موٹی شرارتوں سے اسے رُلانا مشکل ہوگا۔

''ویسے لگتی پیاری ہے!''

''لڑکی ہو کے سائیکل چلاتی ہے!''

''بڑی دلیر ہے، کیوں؟''

جس وقت لڑکے یوں اس پر تبصرے کر رہے تھے، لڑکیاں بھی بڑے جوش کے ساتھ اسی کا ذکر کر رہی تھیں، مگر ان کا نقطہ نظر مختلف تھا، جیسا کہ لڑکیوں کا عموماً ہوتا ہے۔

''کیا خیال ہے؟ ایسی ہی لڑکیوں کو ماڈرن کہتے ہیں نا؟''

''مگر ماڈرن لڑکیوں کے تو بال مردوں کی طرح یہاں تک کٹے ہوئے ہوتے ہیں!''

دوسری نے اپنی دو انگلیوں کی قینچی بنا کر کانوں کے پیچھے لے جاتے ہوئے کہا۔

''اس نے تو جُوڑا بنا رکھا تھا۔''

''مگر کپڑے تو مغربی پہنے تھی!''

''اس کے گھر والوں کی سائیکلوں کی دکان ہوگی۔ جبھی تو اتنی پیاری سائیکل چلا رہی تھی۔ کیسی چمک رہی تھی!''

''کاش ہم بھی سائیکل چلا سکیں۔ سڑک پر اتنی تیزی سے جانے میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔''

اب اس سائیکل سے کیوں کر مقابلہ کریں؟ ان سب کو سچ مچ ایسی مایوسی ہو رہی تھی جیسے انھیں جُوڈو کے میچ میں اٹھا کر زمین پر پٹک دیا گیا ہو۔ ہر کوئی اپنے اپنے طریقے سے اسے نیچا دکھانے کی ترکیب سوچنے میں مصروف تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ کوئی ترکیب ان کے ذہن میں آئے، وہ راس والی پگڈنڈی کے سرے تک پہنچ چکے تھے۔ سرائے پر لگے گھنٹے سے انھیں معلوم ہوا کہ وہ آج بھی تقریباً آٹھ منٹ دیر سے پہنچے ہیں۔ وہ فوراً دوڑ پڑے۔ ان کی پیٹھ پر اور بغل میں دبے ہوئے ڈبوں میں پنسلیں اچانک بج اٹھیں اور تنکوں

کی بنی چپلوں سے گرد اٹھنے لگی۔

عین اسی وقت ان کے گاؤں کے لوگ بھی بڑے ہیجان کے عالم میں تھے۔ گھر والیوں کے کانوں تک بھی نئی استانی کا ذکر پہنچ چکا تھا جو کل کشتی پر آئی تھی اور ان کی بے خبری میں کشتی ہی پر واپس چلی گئی تھی۔ آج وہ اسے دیکھنے کو اور زیادہ بے تاب تھیں کیوں کہ انھوں نے سن لیا تھا کہ وہ مغربی لباس پہنتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اس لباس میں پاس سے گزرتی ہوئی وہ کیسی لگے گی۔ خاص طور پر گاؤں کے دہانے پر بنی دکان کی مالکہ، جس کے اڈے کو ''رصدگاہ'' کہا جاتا تھا، منہ اندھیرے ہی راستے پر نظر جما کر بیٹھ گئی تھی جیسے کسی نئے آنے والے کو دیکھنے کا پہلا حق اس کا ہو۔ چوں کہ بارش بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی، اس نے سوچا کہ نئی استانی کے اعزاز میں گلی پر تھوڑا سا چھڑکاؤ کر دینا اچھا رہے گا۔ مگر جیسے ہی وہ پانی کی بالٹی اٹھا کر باہر نکلی، ایک سائیکل تیزی سے آتی دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکے، سائیکل سوار عورت دوستانہ انداز میں آگے کو خم کھا کر اور ''صبح بخیر'' کہہ کر آگے نکل چکی تھی۔

''صبح بخیر،'' جب دکان کی مالکہ پر انکشاف ہوا کہ یہ کون ہے تو اس نے جواب دیا۔ لیکن اس وقت تک سائیکل ڈھلان اترنے لگی تھی جو اس کے گلی کے فوراً بعد شروع ہو جاتی تھی۔ وہ لپکتی ہوئی برابر والی بڑھئی کی دکان میں پہنچی اور بڑھئی کی بیوی سے، جو دیوار کے اس دھلے ہوئے کپڑے پھیلا رہی تھی، چلا کر بولی:

''سنو! سنو! ابھی ابھی مغربی کپڑے پہنے ایک لڑکی سائیکل پر یہاں سے گئی ہے۔ یہی ہے کیا نئی استانی؟''

''کیا اس نے مردوں کی طرح سفید قمیض اور کالی جیکٹ پہن رکھی تھی؟''

''ہاں ہاں!''

''ارے میرے خدا! سائیکل پر تھی؟ سائیکل پر؟'' بڑھئی کی بیوی اپنے گیلے کپڑوں کو بھول بھال کر چیخی۔ کل وہ اپنی بڑی بیٹی ماتسوئے کو داخلے کی تقریب کے لیے اسکول لے کر گئی تھی۔ دکان والی اپنے انداز سے بڑھئی کی بیوی کی سو فیصد ہم خیال معلوم ہوتی تھی۔

''دنیا سچ مچ بدل گئی ہے۔ اسکول کی استانی، اور سائیکل پر! کہیں لوگ اسے بہت تیز نہ کہنے لگیں،'' اس کا لہجہ فکرمندانہ تھا لیکن آنکھوں کی چمک سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ

اسے ابھی سے یہ خطاب دے چکی ہے۔

دکان سے اسکول کا چند منٹ کا فاصلہ تھا اور یہاں سے سائیکل کے گزرنے کے پندرہ منٹ کے اندر اندر استانی کے بارے میں یہ افواہ گاؤں بھر میں پھیل چکی تھی۔ اسکول کے بچے بھی بڑے جوش میں تھے۔ پچاس سے کچھ کم ان بچوں نے اسٹاف روم کے سامنے سائیکل کو گھیر لیا تھا اور باتیں کرتے ہوئے اتنا شور کر رہے تھے جیسے چڑیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ اور جب استانی سائیکل سے اتر کر بات کرنے کے لیے ان کی طرف بڑھی تو وہ چڑیوں ہی کی طرح ڈر کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ جب وہ ہچکچا کر لوٹی اور اسٹاف روم میں داخل ہوئی تو وہاں سن رسیدہ ماسٹر صاحب، جو اسکول میں اس کے واحد ساتھی تھے، چہرے پر ذرا سی ہمدردی لیے بغیر، خاموش اور ساکت بیٹھے تھے۔ اپنی میز کے ساتھ لگی الماری کی اوٹ میں، سر جھکائے، وہ کچھ کاغذات کو پڑھنے میں مصروف تھے اور انھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ قطعی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ چوں کہ وہ اسکول میں اپنے کام سے متعلق ساری باتیں کل مس کو بایاشی سے چارج لیتے وقت معلوم کر چکی تھی، اس لیے بات کرنے کو کچھ خاص تھا بھی نہیں۔ مگر پھر بھی، اس نے خود سے شکایت کی، ماسٹر صاحب کو ایسی سرد مہری تو نہیں برتنی چاہیے۔ مگر جہاں تک اُن کا تعلق ہے، وہ بے چارے اپنی ہی فکروں میں غلطاں تھے۔

''آخر میں کیا کروں؟ آلو والے اسکول سے نکلی ہوئی نیم تربیت یافتہ استانی اور ویمن ٹیچرز کالج سے فارغ التحصیل استانی میں فرق بھی تو بہت ہے۔ دیکھنے میں چھوٹی سی ہے، مگر بڑی ذہین لگتی ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کیا چیز مشترک ہے جس پر بات کی جائے؟ میں تو اسے کل مغربی لباس میں دیکھ کر ہی ماڈرن سمجھ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ یہ سائیکل بھی چلاتی ہوگی۔ کیا کروں؟ آخر اب کے انھوں نے بیٹھے بٹھائے ایسی فرسٹ کلاس استانی کو یہاں یوں بھیج دیا؟ ان پرنسپل صاحب کا دماغ تو نہیں چل گیا؟''

ان خیالات سے ماسٹر صاحب کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ وہ ایک کسان کے بیٹے تھے۔ انھوں نے ٹیچرز لائسنس حاصل کرنے کے امتحان کی تیاری میں دس سال لگائے تھے اور ابھی چار پانچ سال پہلے ہی یہ درجہ حاصل کیا تھا۔ وہ ذہین سے زیادہ محنتی تھے۔ ہمیشہ لکڑی کی کھڑاویں پہنتے تھے اور ان کا واحد سوٹ کندھوں کے پاس سے بدرنگ ہو گیا تھا۔ وہ بے اولاد تھے اور اپنی عمر رسیدہ بیوی کے ساتھ کفایت شعاری کی زندگی بسر کر رہے

تھے۔ ان کے لیے خوشی کا واحد ذریعہ پیسے جوڑنا تھا۔ وہ ایسے عجیب وغریب آدمی تھے کہ جس کام سے ہر کوئی انکار کر دیتا، اسے بھی قبول کر لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ راس کے اس دور اُفتادہ گاؤں میں آنے کو بھی خوشی سے راضی ہو گئے تھے کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ یہاں انھیں لوگوں سے زیادہ میل ملاقات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جوتے وہ صرف اُس وقت پہنتے جب انھیں، مثال کے طور پر، اساتذہ کی میٹنگ کے سلسلے میں بڑے اسکول جانا ہوتا۔ جہاں تک سائیکل کا سوال ہے، انھوں نے آج تک دو پہیوں والی اس سواری کو چھُوا تک نہ تھا۔ مگر یہ بات تھی کہ گاؤں میں انھیں کافی پسند کیا جاتا تھا، اس لیے انھیں مچھلی یا سبزی کی کبھی کمی نہ ہوئی۔ صفائی ستھرائی کے معاملے میں وہ دیہاتیوں ہی کی طرح بے پروا تھے، کسانوں والا ہی کھانا کھاتے تھے اور اُنھیں کی زبان بولتے تھے۔ اُن کے لیے نئی آنے والی استانی کا مغربی لباس اور اس کی سائیکل سواری بڑی شرمندگی کی باتیں تھیں۔

بہرحال استانی کو اُن کے اِن خیالات کا کچھ اندازہ نہ ہوا۔ سابقہ استانی، مس کوبایاشی، نے اُسے بڑے اسکول میں پڑھنے والے شیطان بچوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ جہاں تک ماسٹر صاحب کا سوال ہے تو مس کوبایاشی نے سرگوشی میں اس سے صرف اتنا کہا تھا: ''عجیب سے آدمی ہیں۔ ان کی زیادہ پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' لیکن اُسے وہ عجیب سے زیادہ کینہ پرور لگے، اور اسے ڈر ہوا کہ کہیں اس کے منہ سے سرد آہ نہ نکل جائے حالاں کہ آج اسکول میں اس کا دوسرا ہی دن تھا۔

اُس کا نام ہیسا کو اوئیشی تھا۔ وہ جھیل جیسی کھاڑی کے دوسرے کنارے پر واقع صنوبر کے اکلوتے پیڑ والے گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ یہاں راس والے گاؤں سے دیکھنے پر اُس کے گاؤں کا صنوبر بالکل بونا سا دکھائی دیتا تھا۔ پیڑ کے پاس اُس کے گھر میں اس کی امّاں، اکیلی، اُسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں گی، کہ اسکول میں اس کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے یا نہیں۔ یہ خیال آنے پر ننھی سی مس اوئیشی کا جی چاہا کہ سینہ پھلا کر گہرا سانس لے اور دل کی گہرائی سے زور لگا کر آواز دے: ''امّاں!''

کچھ دن پہلے پرنسپل نے، جو اس کے مرحوم والد کے دوست تھے، اس سے کہا تھا، ''مجھے احساس ہے کہ راس والا گاؤں بہت دور پڑتا ہے، لیکن ہو سکے تو سال بھر وہاں گزارا کر لو۔ پھر میں تمھیں بڑے اسکول میں بُلوا لوں گا۔ دشواری کا زمانہ ذیلی اسکول میں گزار لینا بہتر ہے۔''

ان باتوں سے قائل ہو کر مس اوئیشی نے ملازمت قبول کر لینے کا فیصلہ کیا تھا اور سوچا تھا کہ سال بھر ہی کی تو بات ہے۔ اسے گاؤں ہی میں کمرہ کرائے پر لے کر رہنے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ روز پیدل وہاں آنا جانا مشکل بات تھی، مگر اسے اپنی امّاں کا خیال تھا جن سے وہ پچھلے دو برس سے ویسے ہی الگ رہ چکی تھی جب میونسپل گرلز اسکول کے برابر والے ٹیچرز اسکول میں تربیت حاصل کر رہی تھی۔ اس پورے عرصے میں اسے اور اس کی امّاں کو یہی امید رہی تھی کہ تربیت پوری ہونے پر دونوں ساتھ رہ سکیں گی۔ سو اُس نے روز اسکول آنے جانے کے لیے سائیکل استعمال کرنے کا فیصلہ کیا حالاں کہ اس کے گاؤں سے یہاں تک پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ سائیکل اس نے اپنی ایک سہیلی کے توسط سے، جو سائیکلوں کے ایک تاجر کی بیٹی تھی، پانچ ماہوار قسطوں پر خریدی تھی۔ چوں کہ اس کے پاس باہر پہننے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے نہ تھے، اس لیے اس نے اپنی امّاں کے پرانے سَرج کے کیمونو کو سیاہ رنگوا کر اپنے لیے، بھدّا سا ہی سہی، ایک سوٹ تیار کر لیا۔ جن لوگوں کو ان تفصیلوں کا علم نہ تھا وہ ضرور اسے ماڈرن یا تیز طرار گمان کر سکتے تھے کیوں کہ آخر وہ سائیکل کی سواری کرتی اور مغربی لباس پہنتی تھی۔ پھر زمانہ بھی تو ۱۹۲۸ کا تھا۔ علاوہ ازیں، یہ گاؤں دنیا بھر سے اتنا الگ تھلگ تھا کہ یہاں عام انتخابات تک کو، جو کچھ عرصہ پہلے ہو چکے تھے، ایک انوکھی چیز گردانا جاتا تھا۔ اس کی سائیکل نئی اور چمکیلی تھی، ہاتھ کا سلا سیاہ سوٹ بھی صاف ستھرا تھا اور بلاؤز بالکل سفید تھا، چناں چہ راس کے گاؤں والوں کو وہ بڑی سجی بنی، تیز طرار اور رسائی سے باہر معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ابھی، جب اسے کام پر آئے دوسرا ہی دن تھا، وہ ان سب باتوں کا کہاں اندازہ کر سکتی تھی! وہ اتنی تنہائی اور اضطراب محسوس کر رہی تھی جیسے کسی غیر ملک میں آ گئی ہو جہاں کسی کو اس کی کوئی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ اس لیے وہ چپ چاپ بیٹھی کھاڑی کی دوسری طرف کے صنوبر کو تکتی رہی اور اس کے پاس بنے اپنے گھر کے بارے میں سوچتی رہی۔

دھپ دھپ! دھپ دھپ! لکڑی کی تختی پر یہ دستک اسکول کا وقت شروع ہونے کا اعلان تھی جس نے مس اوئیشی کو اس کے خیالوں سے چونکا دیا۔ جولڑکا ایڑیاں اٹھا کر لکڑی کی تختی پر دستک دے رہا تھا اسے کل ہی چوتھی کلاس کا مانیٹر منتخب کیا گیا تھا جو اس اسکول کی سب سے اونچی کلاس تھی۔ باہر نکل کر کھیل کے میدان میں پہنچنے پر مس اوئیشی کو احساس ہوا کہ پہلی کلاس کے بچوں کی ٹولی سخت بے چینی کے عالم میں ہے۔ ان کے انداز

میں فخر بھی تھا اور ایک طرح کی گھبراہٹ بھی کیوں کہ وہ آج پہلی بار، اپنے ماں باپ سے جدا ہوکر، اکیلے اسکول آئے تھے۔

تیسری اور چوتھی کلاس کے بچوں کے تیز تیز قدموں سے اپنے اپنے کلاس روم میں چلے جانے کے بعد مس اوئیشی کچھ دیر ہاتھ کو حرکت دیتی رہی تا کہ بچے اس حرکت کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے رہیں، پھر الٹے پیروں چلتی ہوئی ان کی رہنمائی کر کے انھیں کلاس روم تک لے گئی۔ رفتہ رفتہ اسے اپنا اعتماد اور سکون بحال ہوتا محسوس ہوا۔ جب بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو وہ ہاتھ میں حاضری کا رجسٹر لے کر کلاس کی سامنے والی دیوار کے پاس بنے اُٹھے ہوئے پلیٹ فارم پر آئی۔

''بچو!'' وہ بولی۔ ''جب تمھارا نام پکارا جائے تو اونچی آواز میں جواب دینا۔ ٹھیک ہے؟ ماسٹر ایسو کیجی اوکادا!''

بچوں کو ان کے قد کے لحاظ سے بٹھایا گیا تھا۔ ایسو کیجی اوکادا بالکل چھوٹا سا تھا اس لیے سامنے والی صف میں بیٹھا تھا۔ اسے نہ صرف سب سے پہلے اپنا نام پکارے جانے پر گھبراہٹ ہوئی بلکہ اس بات پر بھی کہ زندگی میں پہلی بار اسے ماسٹر کے لقب سے مخاطب کیا گیا تھا۔ اسکی آواز گلے میں اٹک گئی۔

''ماسٹر ایسو کیجی اوکادا، حاضر ہے یا نہیں؟''

وہ گردن گھما گھما کر چاروں طرف دیکھنے لگی تو پیچھے کی صف میں بیٹھے ہوئے ایک موٹے تازے لڑکے نے حیرت انگیز طور پر بلند آواز میں کہا: ''آیا ہے۔''

''تو پھر مہربانی سے کہو: حاضر! ماسٹر ایسو کیجی اوکادا!'' جس لڑکے نے اسے جواب دیا تھا اس کی طرف دیکھتی ہوئی وہ اس کی سیٹ کے پاس پہنچی۔ دوسری کلاس والے بچے ہنس پڑے۔ اصل ایسو کیجی اوکادا گھبرا کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

''سونکی، جواب دو نا!'' دوسری کلاس والی ایک لڑکی، جس کی شکل اس سے بہت ملتی جلتی تھی، دبی ہوئی آواز میں بولی۔ شاید وہ اس کی بہن تھی۔

''کیا تم اسے سونکی کہتے ہو؟'' استانی نے پوچھا۔ سب نے قرار میں سر ہلایا۔

''اچھا، تو پھر ٹھیک ہے، ایسو کیجی عرف سونکی!''

بچے پھر ہنسنے لگے۔ ہنسی میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے استانی نے اپنی پنسل نکال کر رجسٹر پر اس کے نام کے آگے عرفیت چھوٹے حرفوں میں لکھ دی۔

Mashalbooks.com

''اب، ماسٹر تاکے ایچی تاکے شیتا!''

''حاضر!'' ایک ذہین صورت بچے نے جواب دیا۔

''یہ بات ہوئی نا! تمھارا جواب بالکل درست اور صاف ہے۔ اب، ماسٹر کیچی جی تو کودا!''

کیچی جی نے جواب دینے سے پہلے ایک گہرا سانس لیا۔ اتنے میں وہی لڑکا جس نے کچھ دیر پہلے ایسو کیچی کی موجودگی کی اطلاع دی تھی، موقعے کا فائدہ اٹھا کر ذرا گستاخی کے ساتھ زور سے بولا: ''کچن!'' جب اس کی بات پر سب لوگ ہنسے تو یہ لڑکا، جس کا نام نیتا آئزاوا تھا، اگلے لڑکے، تاداشی موری اوکا، کا نام پکارے جانے پر اَور زیادہ دلیر ہو کر چلّایا: ''تانکو!'' جب خود اُس کا نام پکارا گیا تو وہ پورا زور لگا کر بولا: ''حاضر!''

استانی نے ذرا ملامت کے لہجے میں، مگر مسکراتے ہوئے، کہا: ''ماسٹر نیتا آئزاوا! آپ کو دوسروں کے معاملات میں بولنے کی کچھ زیادہ عادت ہے۔ اور آپ کی آواز بھی کچھ ضرورت سے زیادہ اونچی ہے۔ اب میں جس کسی کا نام لوں گی صرف وہی جواب دے۔ مس ماتسوئے کاوا موتو!''

''حاضر!''

''تمھاری عرفیت کیا ہے؟''

''ماتچان۔''

''اچھا۔ کیا تمھارے ابّا بڑھئی ہیں؟''

ماتسوئے نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

''مس میسا کونیشی گوچی!''

''حاضر!''

''تمھاری عرفیت میسا چان ہوگی۔''

مگر بچی نے انکار میں سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولی: ''مائیسان۔''

''واقعی؟ مائیسان۔ کیسا پیارا نام ہے! اب، مس ماسونو کاکاوا!''

''جی!''

مس اوئیشی کا قہقہہ نکلتے نکلتے رہ گیا مگر اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ ہنسی

MashalBooks.com

دباتے ہوئے بولی: ''جی نہیں، ماسانو۔ کہو: حاضر!''

اس پر دخل اندازی کرنے والا نیتا پھر بول اٹھا: ''یہ ماہچان ہے!''

مس اوئیشی نے اس بار اس پر کوئی توجہ نہ دی اور ایک کے بعد ایک نام پکارتی رہی۔

''مس فوجیکو کیسنو شیتا!''

''حاضر!''

''مس سانائے یاما ایشی!''

''حاضر!''

جواب سننے پر مس اوئیشی نظر اٹھا کر بچے یا بچی کو مسکرا کر دیکھتی۔

''مس کوتسورو کابے!''

اچانک سب بچے شور مچانے لگے۔ پہلے تو اُسے تعجب ہوا، کیوں کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا معاملہ ہے، لیکن جب بچوں کی بات اسکی سمجھ میں آئی تو نوجوان استانی کو یہ بات ماسونو کے ''جی'' سے بھی زیادہ عجیب لگی اور وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ بچے کہہ رہے تھے: ''کوتسورو کابے، کوتسورو کابے، اپنا سر دیوار پر رگڑو!''

کوتسورو کابے، جو ہرگز ہار ماننے والی نہیں لگتی تھی، ذرا بھی نہ روئی، مگر اسکا چہرہ سرخ ہو گیا اور سر جھک گیا۔ جب شور تھما اور آخری نام، کوتوئے کا تاگیری، پکارا جا چکا تو پینتالیس منٹ کا پیریڈ پورا ہو چکا تھا۔ اس روز اسکول کا وقت پورا ہونے تک مس اوئیشی کو اچھی طرح یاد ہو چکا تھا کہ کوتسورو کابے ''گھنٹی والے'' کی بیٹی ہے، یعنی اس آدمی کی جس کی پیٹی سے ایک چھوٹی سی گھنٹی بندھی رہتی ہے اور جو گاؤں والوں کے لیے مختلف طرح کے کام کیا کرتا ہے، فوجیکو کینوشیتا ایک قدیم گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، ماسونو کو گاوا، جس نے ''جی'' کہہ کر جواب دیا تھا، اس کا باپ قصبے میں ایک ریستوراں چلاتا ہے، ایسو کیچی اوکا داعرف تانکو ماہی گیروں کے سردار کا بیٹا ہے۔ اگرچہ ان بچوں میں سے ہر ایک باپ اپنے پیشے، یعنی دہی پھلیوں والے، چاول والے یا ماہی گیر، کے نام سے جانا جاتا تھا، لیکن صرف اپنے پیشے سے ہونے والی آمدنی ان کی گزر اوقات کے لیے کافی نہ تھی۔ لہذا یہ سب لوگ اپنے فارغ وقت میں کاشت کاری یا ماہی گیری کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اس گاؤں اور مس اوئیشی کے گاؤں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں ایسے گاؤں تھے جہاں لوگ

MashalBooks.com

ایک منٹ سستائے بغیر کام کرنے پر مجبور رہا کرتے تھے۔ مگر انکے چہروں کو دیکھنے سے احساس ہوتا تھا کہ انھیں کام کی زیادتی پر کوئی پریشانی نہیں ہے۔

یہ تمام بچے، جو آج پہلی بار ''ر'' کی تین مختلف شکلیں سیکھ رہے تھے، گھر پہنچنے پر اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتے، مس اوئیشی سوچنے لگی کہ وہ اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ کیسے چل پائے گی جہاں کام ہی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ اس لمحے اسے یہ سوچ کر شرمندگی سی محسوس ہوئی کہ وہ کیسی جذباتیت کے ساتھ، آنکھوں میں آنسو لیے، اپنے گاؤں کے صنوبر کو تکتی رہی تھی۔ اپنی تدریسی زندگی کے پہلے تجربے سے گزر جانے کے بعد اس کے ذہن پر پہلی کلاس کے اُن بارہ بچوں کا خیال چھایا ہوا تھا جو آج اجتماعی زندگی کے مزے سے پہلی بار آشنا ہوئے تھے۔ اُسے ان کی آنکھیں تصور میں صاف دکھائی دے رہی تھیں، آنکھوں کی ہر جوڑی اپنی اپنی انفرادیت سے چمک رہی تھی۔ ''میں اِن آنکھوں کو کبھی مایوس نہیں کروں گی،'' اس نے خود سے کہا۔

اس سہ پہر کو، سائیکل پر سوار، اپنا پانچ میل لمبا راستہ طے کرتے ہوئے مس اوئیشی کی تازگی اور جوش وخروش نے اسے گاؤں والوں کی نگاہ میں صبح کے مقابلے میں اَور بھی زیادہ تیز طرار بنا دیا تھا۔

''خدا حافظ!''

''خدا حافظ!''

''خدا حافظ!''

وہ ہر ایک کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے الوداع کہتی گئی مگر کم ہی لوگوں نے اسے جواب دیا۔ جن لوگوں نے جواب دیا بھی، انھوں نے صرف گردن ہلا دی۔ اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ اس وقت تک وہ گاؤں بھر کی تنقید کا ہدف بن چکی تھی۔

''سنا ہے اس نے بچوں کی عرفیتیں تک اسکول کے رجسٹر میں لکھ لیں۔''

''بچے کہہ رہے تھے اس نے میسا کو نیشی گوچی کی تعریف بھی کی تھی!''

''اس نے اپنی طرف داریاں ابھی سے طے کر لی ہیں۔ میسا کو کے گھر والوں نے اسے پھُسلانے کے لیے کوئی تحفہ وحفہ دیا ہوگا، اور کیا!''

جو کچھ ہو رہا تھا اس سے قطعی بے خبر، مزے سے سائیکل چلاتی چھوٹی سی مس

اوئیشی گاؤں کے سرے والی ڈھلان تک پہنچ گئی تھی۔ وہاں چڑھائی چڑھنے کے لئے اس نے ذرا سا آگے کو جھک کر پیروں پر اپنے بدن کی ساری طاقت لگائی اور آگے بڑھنے لگی۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر اپنی امّاں کو اپنے جوش وخروش کا حال سنانا چاہتی تھی۔ یہ ڈھلان پیدل چلنے والوں کے لیے کوئی خاص مشکل نہیں تھی، اور صبح کو سائیکل پر اسکول آتے ہوئے خود اس کی رفتار میں بھی ایک خوش گوار تیزی لے آتی تھی؛ مگر اس وقت یہ ایک رکاوٹ معلوم ہو رہی تھی۔ مگر وہ اتنی خوشی اور احسان مندی محسوس کر رہی تھی کہ اسے اس بات پر بھی افسوس نہ ہوا کہ اسے ڈھلان سے اترنے کے بجائے اس پر چڑھنا پڑ رہا ہے۔

جب وہ ڈھلان کی چوٹی پر پہنچی تو اسے بڑے اسکول کے لڑکے لڑکیوں کی وہی ٹولی دکھائی دی جو صبح آتے ہوئے ملی تھی۔

''اوئیشی، کوئیشی!''

''اوئیشی، کوئیشی!''

جوں جوں وہ بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ ٹولی کے نزدیک آئی گئی، لڑکے لڑکیوں کا کورَس اونچا ہوتا گیا۔ پہلے تو اس کورَس کے الفاظ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ مگر جب وہ سمجھی کہ اسی کا ذکر ہو رہا ہے تو بے اختیار زور سے ہنس پڑی۔ وہ جان گئی کہ یہ اس کی نئی عرفیت ہے۔ اس نے جان بوجھ کر سائیکل کی گھنٹی زور سے بجائی اور ٹولی کے پاس سے گزرتے ہوئے چلّا کر بولی: ''خدا حافظ!''

بچوں نے مسّرت کا نعرہ بلند کیا اور اپنا ''اوئیشی کوئیشی!'' کا کورس جاری رکھا۔ اس کی پیٹھ کے پیچھے یہ آوازیں رفتہ رفتہ مدھّم پڑتی گئیں۔

اُس روز اسے ''استانی صاحبہ'' کے لقب کے ساتھ ساتھ ''مس کوئیشی'' کی عرفیت بھی مل گئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نام اسے اس کی چھوٹی قامت کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے اس کی نئی سائیکل چمکتی رہی اور وہ راس والی سڑک پر اپنا سفر طے کرتی رہی۔

MashalBooks.com

جادو کا پُل

پتلی اور ڈھائی میل لمبی راس کے تقریباً درمیان میں ایک اَور بستی واقعی تھی۔ کھاڑی کو جانے والی سفید سڑک اس مقام پر آ کر مڑتی اور راس کی چوڑائی کو پار کرتی تھی پھر وہ کھلے سمندر کے ساتھ ساتھ راس کے اسکول والے گاؤں کی سمت بڑھنے لگتی تھی۔ ہر صبح مس اوئیشی کی ملاقات بڑے اسکول جانے والے بچوں سے، تقریباً بلا ناغہ، اسی مقام پر ہوتی جہاں سے سڑک سمندر کے ساتھ ساتھ گھما ولینا شروع کرتی تھی۔ اگر ان کی ملاقات اس مقام سے ذرا ہٹ کر ہوتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ دونوں میں سے کسی ایک کو یقیناً دیر ہوگئی ہے اور اب اسے جلدی کرنی پڑے گی۔ دیر سے پہنچنے والے اکثر بچے ہی ہوتے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر پکار اٹھتے: ''افوہ! مس کوئیشی آ رہی ہیں!'' اور اپنی رفتار تیز کر دیتے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ استانی ابھی سمندر کے کنارے کنارے ہی سائیکل چلاتی آ رہی ہے اور بچے وہاں پہنچ گئے۔ ایسے موقعوں پر وہ تیز تیز پیڈل مارنے لگتی۔ بچوں کے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع ہوتا تھا۔ جب اس کی سائیکل ان کی ٹولی کے برابر سے گزرتی تو وہ اس سرخ ہوتے ہوئے چہرے پر نظر جما کر اسے چھیڑنے کے لیے نعرے لگاتے:

''استانی کو دیر ہوگئی! کیسی اچھی بات ہے!''

''اب ان کے پیسے کٹیں گے!''

ٹولی میں چند ایک ایسے بھی تھے جو راستے میں اس کے ساتھ کوئی ناگوار شرارت کر گزرتے۔ ان شرارتوں کا سلسلہ جب دراز ہوتا تو اس نے گھر پہنچ کر اپنی امّاں سے گلہ کیا۔

''ذرا سوچیے، اتنے اتنے سے بچے اور تنخواہ کاٹنے کی باتیں کرتے ہیں! انھیں روپے پیسے سے بڑا لگاؤ ہے۔ کتنی بُری بات ہے۔ ہے نا؟''

اس کی امّاں مسکراتیں اور کہتیں: ''احمق مت بنو! ایسی باتوں پر دل جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر ایک ہی سال کی تو بات ہے۔ ذرا دھیرج سے کام لو!''

MashalBooks.com

اصل میں مس اوئیشی کو اپنی ماں کے دلاسے کی کچھ ایسی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ان باتوں سے اس کا دل دُکھتا دُکھتا نہیں تھا۔ جب وہ اس چھیڑ چھاڑ کی عادی ہوگئی تو صبح سویرے سائیکل پر اپنے پانچ میل کے سفر سے ایسا لطف اٹھانے لگی جس کا پہلے اسے گمان تک نہ تھا۔ جب وہ راس کی چوڑائی کو پار کرنے لگتی تو سائیکل کی رفتار خود بخود تیز ہو جاتی اور وہ انجانے میں بچوں کو آگے بڑھ کر جا لینے کی کوشش کرنے لگتی۔ اس پر بچوں کو بھی اپنی رفتار بڑھانی پڑتی۔

پہلی ٹرم کے پورا ہونے تک مس اوئیشی اور بچوں کی ٹولی کے درمیان یہ رسّا کشی جاری رہی۔ ایک روز معمّر ماسٹر صاحب کسی کام سے بڑے اسکول گئے اور واپسی پر یہ انوکھی خبر لائے کہ اس ٹرم کے دوران ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ بچے دیر سے اسکول پہنچے ہوں۔ اس بات سے ہر کوئی واقف تھا کہ تین میل کا راستہ طے کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بہت زمانے سے راس کے گاؤں سے آنے والے بچوں کو دیر سے پہنچنے پر تنبیہ نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ ہر روز متواتر وقت پر پہنچیں تو تعریف کے مستحق تھے۔ اور بلاشبہ ان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ ماسٹر صاحب بھی ایسے خوش تھے جیسے یہ خود اُن کا کارنامہ ہو۔

''اصل وجہ یہ ہے کہ اس برس کی ٹولی میں ایک بڑی غیر معمولی بچی شامل ہے،'' انھوں نے کہا۔ ان کا خیال تھا کہ بچوں کے وقت پر اسکول پہنچنے کی وجہ وہ بچی ہے جس نے بڑے اسکول کے تمام شاگردوں کی بہ نسبت نہایت شان دار کارکردگی دکھائی تھی۔ بچوں کا وقت پر پہنچنا دراصل استانی کی سائیکل کی بدولت تھا۔ مگر خود مس اوئیشی کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا۔ بلکہ وہ بے چاری گاؤں کے بچوں کی پابندی وقت سے بڑی متاثر ہوتی تھی اور ان کی شرارتوں کو نظر انداز کرنے پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دل میں اپنی پابندیِ وقت پر خود کو بھی داد دے لیا کرتی۔

''میں خود بھی صرف ایک بار دیر سے پہنچی ہوں، اور وہ بھی اس وجہ سے کہ راستے میں میری سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا،'' اس نے خود سے کہا۔ کھڑکی سے باہر تکتے ہوئے اس نے اپنی امّاں کے بارے میں سوچا جو اس کی اتنی ہمّت بڑھاتی تھیں۔ کھاڑی کا پُرسکون پانی دھوپ میں چمک رہا تھا، جیسا کہ گرمیوں کے دنوں میں توقع کی جا سکتی ہے، اور صنوبر والا گاؤں، جہاں اس کی امّاں تھیں، موسمِ گرما کے بادلوں تلے کچھ کچھ دھندلا

دکھائی دیتا تھا۔ ساحلی ہوا کے خوش گوار جھونکے پوری کھلی کھڑکی میں سے اندر آ کر اسکے وجود کو دو دن بعد شروع ہونے والی گرمیوں کی چھٹیوں کی مسرور امیدوں سے بھر رہے تھے۔ لیکن اسے گاؤں والوں کی طرف سے اب بھی تھوڑی سی ناخوشی محسوس ہوتی تھی جنہوں نے اپنے دل اس کے لیے اب تک وا نہ کیے تھے۔ جب اس نے ان کی سرد مہری کا ماسٹر صاحب سے شکوہ کیا تو وہ اتنے زور سے ہنسے کہ ان کی پچھلی ڈاڑھوں کی خالی جگہیں دکھائی دینے لگیں۔ وہ بولے: ''تم نے ان سے کچھ زیادہ ہی امیدیں لگا رکھی ہیں۔ خواہ تم ان کے گھروں کے کتنے ہی چکر لگاؤ، وہ تم سے بے تکلف نہیں ہوں گے، کیوں کہ تم مغربی لباس پہنتی ہو اور سائیکل کی سواری کرتی ہو۔ لوگ تمھیں ضرورت سے زیادہ ماڈرن سمجھ کر تم سے کتراتے ہیں۔ یہ گاؤں کچھ اسی طرح کا ہے۔''

مس اوئیشی چونک پڑی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ سر جھکا کر ماسٹر صاحب کی کہی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگی۔ ''کیا ان کے خیال میں مجھے کیمونو پہن کر پیدل اسکول آنا چاہیئے؟ یعنی ہر روز دس میل.....''

گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اس نے کئی بار اس بات پر غور کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ خود کو اپنا معمول بدلنے پر آمادہ کر سکتی، چھٹیاں ختم ہو گئیں اور نئی ٹرم شروع ہو گئی۔ اگرچہ کیلنڈر کے حساب سے ستمبر کا مہینہ تھا، پھر بھی وہ لمبی چھٹیاں کے بعد گرمی کی شدت سے خوف زدہ تھی۔ بے چاری چھوٹی سی استانی کا وزن تھوڑا اور کم ہو گیا تھا اور رنگت کچھ زردسی ہو گئی تھی۔

نئی ٹرم کی پہلی صبح کو، جب وہ اپنے گھر سے نکل رہی تھی، اس کی امّاں بولیں، ''چلو، سال کا ایک تہائی حصّہ تو گزر ہی گیا۔ بس کچھ دن اور صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔''

ہمّت بندھانے والی ان باتوں کے ساتھ انھوں نے سائیکل دہلیز سے باہر نکالنے میں بیٹی کی مدد کی۔ مس اوئیشی لاکھ استانی بن گئی ہو، تھی تو انسان ہی، سو کبھی کبھی اپنی امّاں سے یوں بات کرتی جیسے کوئی لاڈ پیار سے بگڑی ہوئی بچی ہو۔

''اف! صبر، صبر، صبر.....کیا مصیبت ہے!'' یہ جواب دے کر وہ سائیکل پر سوار ہوئی اور تیزی سے نکل گئی جیسے غصے میں ہو۔ کئی ہفتوں کے بعد پہلی بار سائیکل پر بیٹھ کر ہوا کے جھونکوں میں سے گزرتے ہوئے اس پر خوش گوار کیفیت چھا گئی۔ مگر اس خیال سے اس

MashalBooks.com

کا دل بیٹھنے لگا کہ آج کے بعد سے سائیکل پر پانچ میل جانے اور پانچ میل آنے کا معمول پھر سے شروع ہو جائے گا۔ چھٹیوں میں اس نے کئی بار اپنی امّاں سے یہ ذکر چھیڑا تھا۔ راس والے گاؤں میں کمرہ کرائے پر لے کر رہنے کی تجویز بھی زیرِ بحث آئی تھی، مگر پھر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ سائیکل پر روز اسکول آنا جانا ہی ٹھیک ہے۔ صبح کا سفر تو خاصا خوش گوار گزرتا، لیکن سہ پہر کو سڑک پر چمکتی اور پیٹھ پر چبھتی دھوپ کی حدّت میں سائیکل چلا کر گھر لوٹنے میں اس پر اتنی تھکن چھا جاتی کہ کبھی کبھی تو سانس لینے میں مشکل ہونے لگتی۔ راس کا گاؤں اب اسے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ کیسی مصیبت ہے، وہ خود سے بولی، کہ متواتر، ہر روز، لمبا راستا طے کر کے کھاڑی کے اُس پار جانا پڑتا ہے۔ اور سونے پر سہاگہ یہ کہ گاؤں والوں کو اس کی سائیکل کی سواری بُری لگتی ہے!

''جہنم میں جاؤ!'' یہ فقرہ سچ مچ اسکے منہ سے نہیں نکلا، مگر وہ بے اختیار سامنے راس پر نظر جما کر پوری قوّت سے پیڈل مارنے لگی۔ اسکے داہنے ہاتھ پر کھاڑی کے پانی میں غیر معمولی جوار بھاٹا تھا۔ راس کی نوک کی مخالف سمت میں سائیکل چلاتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ کیلنڈر کے حساب سے آج طوفانی موسم کا پہلا دن ہے۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس کے گالوں پر ہوا کے تھپیڑے اتنے زور کے کیوں پڑ رہے ہیں اور اردگرد سمندر کی مہک اتنی تیز کیوں ہے۔ راس پر واقع پہاڑیوں کی چوٹیاں لرزتی ہوئی سی لگ رہی تھیں اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ کھلے سمندر میں کیسی طغیانی ہوگی۔ اسے کچھ فکر سی ہونے لگی۔ اگر ایسا ہوا تو سائیکل سواری کے بجائے بوجھ بن جائے گی۔ اس نے خود کو دلاسا دیا کہ اب اتنی دور آنے کے بعد پیدل چلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ خیالات اس کے سر میں پرندوں کی طرح اڑ رہے تھے۔

''ہوا، تھم جا! میں علی بابا کی طرح حکم دیتی ہوں۔ اچانک ہوا تھم جاتی ہے اور سمندر حیرت انگیز طور پر خاموش ہو جاتا ہے، بالکل صبح سویرے کی کسی جھیل کی طرح پُرسکون۔ پُل، پانی پر تن جا! میں انگلی سے اشارہ کرتی ہوں۔ دم بھر میں پانی کے اوپر نہایت عمدہ پُل بن جاتا ہے، قوسِ قزح جیسا حسین پُل۔ صرف مَیں اسے دیکھ سکتی ہوں اور پار کر سکتی ہوں۔ قوسِ قزح کے رنگوں والے محرابی پُل پر سے آہستہ آہستہ گزرنے پر بھی میں وقت سے پون گھنٹا پہلے راس پر پہنچ جاتی ہوں۔ گاؤں والے کیسے حیران رہ جاتے ہیں! مجھے دیکھ کر وہ سب اپنی گھڑیاں پون گھنٹا آگے کر لیتے ہیں۔ بچوں کو بوکھلایا ہوا دیکھ کر مجھے

افسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ جلدی جلدی نوالے حلق سے اتارتے ہیں اور الٹا سیدھا ناشتا کر کے گھروں سے باہر دوڑتے ہیں۔ ماسٹر صاحب ابھی جاگے ہی ہیں کہ میں اسکول پہنچ جاتی ہوں۔ وہ حیرت زدہ ہو کر کنویں کی طرف لپکتے ہیں اور جلدی جلدی منہ دھونے لگتے ہیں۔ اور رہیں اُن کی بوڑھی بیگم، تو بچاری کو کپڑے تک بدلنے کی مہلت نہیں ملتی۔ وہ شب خوابی کے کپڑوں کو ایک ہاتھ سے درست کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کوئلوں کی انگیٹھی سلگاتی ہیں۔ میری طرف دیکھ کر وہ کچھ عجیب سی شرمندگی سے مسکراتی ہیں اور آنکھیں اور باچھیں صاف کرتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کچھ تکلیف ہے اور صبح اٹھنے پر وہ انھیں پوری طرح کھول نہیں پاتیں۔''

صرف آخری جملہ اتنا درست تھا کہ مس اوئیشی کے منہ سے ہلکی سی ہنسی نکل گئی، مگر اس کے ساتھ ہی اسکا تخیل بھی دُھند کی طرح ہوا میں گھُل گیا۔ سامنے سے آتے بچوں کی، ہوا سے بے ترتیب ہوتی آوازیں اس کے کان میں پڑیں جو ہمیشہ کی طرح اسے پکار رہی تھیں: ''مس کوئیشی!''

مہینوں بعد ان کی مانوس آوازیں سنکر اسے تقویت محسوس ہوئی اور اس نے چلاّ کر جواب دیا: ''ہاں آں!'' مگر ہوا کا زور ایسا تھا کہ آواز بجائے آگے جانے کے پیچھے کی طرف جاتی ہوئی لگی۔ سمندر، اس کے اندازے کے مطابق، بہت طغیانی میں تھا اور اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ بالکل ویسا ہی نظارہ تھا جیسا طوفانی موسم کے کسی دن دکھائی دے سکتا ہے۔

''تم لوگوں کو آج دیر ہوگئی،'' وہ بولی۔ ''تقریباً پینتالیس منٹ۔''

بچے اس سے بات نہیں کر رہے تھے اور انکے چہروں کے تاثر سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کیا ہے۔ لیکن اس کی یہ بات سن کر وہ سمجھے کہ انھیں واقعی دیر ہوگئی ہے اور وہ دوڑنے لگے۔ مس اوئیشی بھی سامنے سے آتی تیز ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے زور لگا کر پیڈل مارنے لگی۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی طوفانی جھکڑ نہ جانے کہاں سے آتا اور وہ سائیکل سے اُترنے پر مجبور ہو جاتی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ آج سچ مچ پون گھنٹا دیر سے پہنچے گی۔ اُس کا اپنا، صنوبر والا گاؤں بھی ساحل پر واقع تھا۔ لیکن وہ راس کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے طوفان کی زد سے محفوظ رہتا تھا۔ اس کے برعکس پتلی راس پر واقع گاؤں ہر بار سمندر کی سمت سے طوفان کی زد میں آجاتا اور بہت نقصان اٹھاتا۔ وہ

سائیکل پر سوار، بڑی مشقت سے اس سڑک پر سفر کرتی رہی جس پر ٹوٹی ہوئی شاخیں اور ٹہنیاں بکھری پڑی تھیں۔ وہ سائیکل کو چلانے سے زیادہ دھکیل رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ واقعی گاؤں تک بہت دیر سے پہنچی۔ اس مقام پر آ کر جہاں سے پورے گاؤں کا منظر دکھائی دیتا تھا، وہ غیر ارادی طور پر رک گئی اور اس کے منہ سے نکلا: ''خدایا!''

گاؤں کے اِس سرے پر چھوٹی سی گودی تھی۔ جہاں سے یہ گودی شروع ہوتی تھی، اسکے بالکل پاس ماہی گیری کی ایک کشتی اوندھی پڑی تھی اور اس کی پُشت کسی ویل کی سی نظر آ رہی تھی۔ کچھ اَور کشتیاں بھی، جنھیں غالباً گودی تک نہیں لایا جا سکا ہوگا، طوفانی لہروں کی لپیٹ میں آ کر سڑک پر جا پڑی تھیں۔ پوری سڑک لہروں کی لائی ہوئی بجری سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس پر سے سائیکل کا گزرنا ناممکن تھا۔ گاؤں کا منظر بالکل نامانوس دکھائی دیتا تھا۔ ساحل کے ساتھ والے مکانوں کی چھتوں سے کھپریلیں اکھڑ گئی تھیں۔ لوگ چھتوں پر چڑھے اُن کی مرمّت کر رہے تھے۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ استانی کے آداب کا جواب دینے کا سوال ہی نہ تھا۔ اور خود اُسے بھی سائیکل کو سڑک پر پڑے پتھروں سے بچاتے ہوئے ہاتھوں سے دھکیل کر آگے بڑھانے کی فکر لاحق تھی۔ وہ اسی طرح اسکول تک پہنچی۔ جب وہ پھاٹک سے اندر داخل ہوئی تو پہلی کلاس کے بچوں نے دوڑ کر اسے گھیر لیا۔ اُن کی آنکھیں گویا رقص کر رہی تھیں اور وہ اتنے پُر جوش تھے جیسے پچھلی رات کو آنے والا طوفان ان کے لیے کوئی خوشی کی چیز ہو۔ وہ سب اپنی باریک آوازوں میں ایک ساتھ بولنے لگے، مگر ماسونو کو گاوا، جو ان سب میں تیز تھی، اپنی اونچی آواز کے باعث سب سے بازی لے گئی جیسے اسے یقین ہو کہ طوفان کا احوال سنانا صرف اُسی کا حق ہو۔

''استانی صاحبہ،'' وہ اپنے پتلے ہونٹوں والے دہانے سے چلّا کر بولی، ''سونکی کا گھر گر گیا، بالکل کیکڑے کی طرح اُلٹ گیا!''

یہ سن کر مس اوئیشی کی آنکھیں تشویش سے پھیل گئیں۔ چہرہ زرد پڑنے لگا، اور وہ بلند آواز میں بولی: ''اوہ سونکی! تمھارے گھر والے تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟'' اس نے ادھر اُدھر گردن گھمائی اور لڑکے کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھا۔ لگتا تھا وہ ابھی صدمے کے اثر سے پوری طرح نکلا نہیں ہے۔

''مس اوئیشی، میرے مکان کے رہٹ کا کھمبا پھٹ گیا اور اس کے پاس لگی ہوئی ناند بھی ٹوٹ گئی،'' ماسونو پھر بولی۔

MashalBooks.com

''اوہو! کتنے افسوس کی بات ہے! اور دوسرے مکانوں کا کیا ہوا؟''

''دکان والی چھت کی مرمت کے لیے اوپر چڑھی اور وہاں سے گر پڑی!''

''اُف! نہیں!''

''مائیسان کے گھر میں کھڑکیوں کے پٹ اکھڑ گئے۔ ہے نا مائیسان؟''

مس اوئیشی کو احساس ہوا کہ ابھی تک صرف ماسونو باتیں کر رہی ہے۔

''اور تم سب لوگ؟ تمھارے ہاں تو سب خیریت ہے نا؟'' اس نے بچوں سے پوچھا۔ اس کی آنکھیں سانائے یاماایشی سے چار ہوئیں۔ وہ ایک شرمیلی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور وہ صرف سر ہلا کر ''ہاں'' کہہ سکی۔ ماسونو نے مس اوئیشی کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے اس کے اسکرٹ کا کنارہ پکڑ کا کھینچا اور کہنے لگی: ''استانی صاحبہ، ایک اس سے بھی بُری بات ہوئی ہے۔ تاکا اچی کی چاول کی دکان میں ایک چور گھُس گیا۔ کیوں، ٹھیک ہے نا تاکا اچی؟ وہ چاولوں کی ایک بوری چُرا کر بھاگ گیا نا؟''

لڑکا، جس سے اس بات کی تصدیق چاہی جا رہی تھی، تائید میں سر ہلا کر بولا: ''ہم نے احتیاط نہیں کی۔ ہم نے سوچا طوفان کی رات میں کون چوری کرنے آئے گا۔ مگر صبح اٹھ کر ہم نے دیکھا، کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابّا نے کہا، بوری میں سے چاولوں کے دانے گرتے ہوئے چور کے مکان تک گئے ہوں گے اور اس کا پتہ چل جائے گا۔ مگر انھوں نے سڑک پر جا کر دیکھا تو کوئی دانہ نہیں تھا۔''

''اوہو، تم لوگوں پر کیسا مشکل وقت آ پڑا..... اچھا، ذرا میں اپنی سائیکل وہاں رکھ آؤں، پھر تم سے ملتی ہوں۔''

معمول کے مطابق اسٹاف روم کی طرف بڑھتے ہوئے اسے اچانک احساس ہوا کہ وہاں ہمیشہ سے زیادہ روشنی ہے، اور وہ ٹھٹھک گئی۔ اسے ایک بار پھر صدمے سے گزرنا پڑا۔ کنویں کے اوپر لگی ہوئی چھت اُڑ گئی تھی۔ جہاں پہلے ٹین کی چادر پڑی ہوئی تھی وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ خالی جگہ میں سے اسے آسمان پر تیرتے بادل دکھائی دیے۔

ماسٹر صاحب، سر پر رومال باندھے، ایسے لگ رہے تھے جیسے بہت بھاگ دوڑ کرتے رہے ہوں۔ انھوں نے اس سے بڑی غیر معمولی شائستگی کے ساتھ بات کی: ''کہیے استانی صاحبہ! آپ کیسی ہیں؟ رات بہت زور کا طوفان تھا، ہے نا؟''

اُن کی بیگم بھی باہر نکل آئیں۔ انھوں نے اپنے کیمونو کی آستینیں ڈوری سے کس

کر باندھ رکھی تھیں۔ وہ اپنے سر پر سے رومال اتارتے ہوئے آداب کہنے کو جھکیں اور مس اوئیشی سے اس کا حال پوچھا۔ ''صنوبر تو ٹوٹ گیا ہوگا؟'' بڑی بی نے سوال کیا۔

''کیا؟'' مس اوئیشی نے چونک کر سر گھمایا اور اپنے گاؤں کی سمت میں نظر ڈالی۔ پیڑ اپنی ہمیشہ کی جگہ پر کھڑا تھا۔ مگر جب اُس نے ذرا غور سے دیکھا تو وہ واقعی کچھ مختلف سا نظر آیا۔ طوفان کا حملہ اُس کے گاؤں پر اتنا شدید نہیں ہوا تھا لیکن صنوبر کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اسکی ایک پھیلی ہوئی شاخ ہوا کے زور سے ٹوٹ کر تنے سے الگ ہوگئی ہے۔ پیڑ کو معمولی سا نقصان پہنچا تھا، مگر مس اوئیشی کو یہ سوچ کر ندامت ہوئی کہ خود اُسے، جو اُسی گاؤں کی رہنے والی تھی، اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ کھاڑی کے آس پاس آباد لوگوں کے لیے یہ پُرانا صنوبر بہت عرصے سے مقام کی نشانی کے کام آتا تھا۔ اَور زیادہ شرمندگی اُسے اس وجہ سے تھی کہ آج صبح وہ کیسی بے نیازی کے ساتھ صنوبر کے پاس سے اٹھ کر راس تک پہنچنے والے جادو کے پُل کے تصوّر میں محو چلی آ رہی تھی اور اپنے ہاتھ کی گردش سے سمندر کی لہروں کو خاموش کرنے کا کھیل کھیل رہی تھی۔ اَور تو اَور، اس نے اپنے تصوّر میں گاؤں والوں کو ایسی بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا کہ انھیں اپنی گھڑیاں پَون گھنٹا آگے کرنی پڑیں! اور اب، یہاں پہنچتے پر، اس نے گاؤں والوں کو اُس سے بھی بڑی بوکھلاہٹ میں مبتلا پایا۔ ماسٹر صاحب، بجائے جلدی جلدی منہ دھونے کے دوڑنے کے، جیسا کہ اُس نے تصوّر کیا تھا، ننگے پیر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ اُن کی بیگم کوئلوں کی انگیٹھی کب کی دہکا چکی تھیں اور اب اپنی آستینیں ڈوری میں اُڑس کر کام میں مصروف تھیں۔

''افوہ، دوسری ٹرم کا پہلا دن کیسا غلط شروع ہوا ہے!'' مس اوئیشی اپنے آپ سے بولی۔ اسے پچھتاوے کے ساتھ یاد آیا کہ آج صبح گھر سے نکلتے ہوئے اس نے اپنی امّاں کے ساتھ کیسا نامناسب برتاؤ کیا تھا۔ اس نے طے کیا کہ تیسرے پیریڈ میں وہ بچوں کو ٹائم ٹیبل کے مطابق موسیقی کا سبق دینے کے بجائے انھیں لے کر اُن خاندانوں کے پاس جائے گی جو اس بدقسمتی کا نشانہ بنے ہیں۔ اس دورے پر نکل کر وہ سب سے پہلے نیشی گوچی کے گھر رکی جو اسکول کے بالکل نزدیک تھا اور اس کے گھر والوں سے ہمدردی کے الفاظ کہے۔ بچوں نے اُسے بتایا کہ سب سے زیادہ نقصان سونکی کے گھر والوں کو پہنچا ہے جن کا مکان پورا ڈھے گیا ہے۔ چناں چہ اس کے بعد وہ سب سونکی کے گھر گئے جو گاؤں کے مندر کے برابر پہاڑی پر تھا۔ مس اوئیشی کو یاد آیا کہ صبح کے وقت ماسونو نے سونکی کے

گرے ہوئے مکان کو کس طرح اُلٹے کیکڑے سے تشبیہ دی تھی۔ اس نے سوچا کہ ماسونو نے یہ تشبیہ بڑوں سے سنی ہوگی، پھر بھی عجیب طرح سے اس سے سن کر اس کے اندر بڑی حقیقی تصویر اُبھرتی تھی۔ بہرحال، پڑوسیوں کی مدد سے مکان کا ملبہ زیادہ تر ہٹایا جا چکا تھا۔ ''وہ پھلیوں'' کی دکان گھر سے ذرا ہٹ کر تھی اور گرنے سے بچ گئی تھی۔ سونکی کے گھر والے اپنی فرشی چٹائیاں وہاں لے گئے تھے اور انھیں کچے فرش پر بچھا کر گھرداری کا سب سامان ان پر چُن لیا تھا۔ کچھ دیر تک مس اوئیشی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ یہ سوچ کر اُس کا دل بھر آیا تھا کہ آج رات کے بعد سے اس گھر کے ساتوں افراد کو اس چھوٹی سی کوٹھری میں سونا پڑے گا۔ ماتسوئے کا وامونو کے باپ نے، جو مدد کرنے والوں میں شامل تھا، اسے کچھ کچھ مذاق کے سے لہجے میں مخاطب کیا، جو بڑھئیوں کا عام طریقہ ہے، لیکن اس لہجے میں طنز کی بھی جھلک تھی: ''اوہ، استانی صاحبہ آئی ہیں! کیا آپ ہمارا ہاتھ بٹانے آئی ہیں؟ تو پھر آپ بچوں کو سڑک پر پتھر لڑھکا کر ساحل کی طرف کرنے کے کام پر کیوں نہیں لگا دیتیں؟ یہاں کا کام آپ مجھ بڑھئی پر چھوڑ دیں۔ یا آپ بسولا چلانا چاہتی ہیں؟''

اس کے آس پاس کھڑے لوگ ہنسنے لگے جیسے وہ سب اس کا مذاق اڑانا چاہتے ہوں۔ وہ یہ سوچ کر ایک دم گھبرا گئی کہ اپنی وضع قطع سے وہ ان لوگوں کو بڑی بے پروا دکھائی دے رہی ہوگی۔ مگر اس کے باوجود وہ وہیں جمی کھڑی رہی تاکہ سونکی کے گھر والوں سے ہم دردی کر سکے جو اس کے یہاں آنے کا اصل مقصد تھا۔ لیکن کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ اُسے واپس لوٹنا پڑا اور اپنی سبکی کو چھپانے کی کوشش میں بچوں سے کہنا پڑا: ''کیا خیال ہے، ہم سب مل کر سڑک پر سے پتھر ہٹا دیں؟''

''ہاں ہاں!''

''بالکل!''

ایک دم بچے خوشی خوشی اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ آج کا دن، طوفان کے فوراً بعد والے دنوں کی طرح، گرم مگر خوش گوار تھا۔ ہوا اتنی شفاف تھی کہ پورا گاؤں ایک سرے سے دوسرے سرے تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔

''چلو احمق پتھر!''

''بھاگو بوڑھی چٹان!''

ہر بچہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق پتھر اٹھا اٹھا کر ساحل کی طرف لڑھکا رہا تھا جس

کی سطح سڑک کی نگر سے چند فٹ نیچے تھی۔ سڑک پر پتھر یوں بچھے ہوئے تھے جیسے کوئی پتھریلا ساحل ہو۔ ان میں سے کچھ پتھر اتنے بڑے تھے کہ دو دو بچوں کو مل کر اٹھانے پڑتے تھے۔ سمندر اب بالکل پُرسکون معلوم ہو رہا تھا، وہی سمندر جو پچھلی رات اس قدر اشتعال میں آ گیا تھا کہ اس نے ان تمام پتھروں کو بند کے اوپر سے اچھال کر سڑک پر لا پھینکا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر آدمی فطرت کی بے پناہ طاقت پر حیران ہو جاتا تھا۔ راس کے گاؤں میں پچھلی رات بڑی افراتفری رہی ہو گی پتھروں اور چٹانوں کو اچھالتی غضب ناک لہریں، اور مکانوں کو ڈھاتی ہوئی زبردست ہوائیں۔ مس اوئیشی کو یہ محسوس کر کے بڑا تعجب ہوا کہ راس طوفان کی شدت اپنے اوپر لے کر کس طرح اُس کا زور توڑ دیتی ہے اور اس کی بدولت دوسری طرف کے ساحلی گاؤں کیسے ساحل کی طرف لڑھکا دیا۔ اس نے تیسری کلاس کے ایک بچے کو دیکھا جو بڑی مہارت سے ٹھوکریں مار مار کر پتھروں کو سڑک پر سے سمندر کی سمت اچھال رہا تھا، اور اس سے پوچھا: ''کیا طوفان میں ہر بار یہی کچھ ہوتا ہے؟''

''جی ہاں''

''اور تم ہر بار سڑک پر سے پتھر ہٹاتے ہو؟''

''جی ہاں۔''

ٹھیک اسی موقعے پر ماسونو کو گاوا کی ماں پاس سے گزرتے ہوئے بولی: ''اوہ، مس اوئیشی، آپ تو بہت کام کر رہی ہیں! کہیں سارے پتھر آج ہی ہٹانے کا تو ارادہ نہیں؟ ایسا نہ کیجئے گا۔ اگلے کچھ دنوں میں اَور بھی طوفان آئیں گے۔''

ماسونو کی ماں نے، جو قصبے میں سرائے اور ریستوران کی مالک تھی، بتایا کہ وہ طوفان کی خبر سن کر گاؤں کا حال دیکھنے آئی تھی کیوں کہ اس کی بیٹی یہیں رہتی ہے۔ ماسونو دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی اور بولی؛ ''امّاں، رات کو مجھے اتنا ڈر لگا۔ اتنا شور تھا کہ میں بستر میں نانی سے چمٹ گئی۔ صبح کو ہم نے اُٹھ کر دیکھا تو رہٹ کا کھمبا بیچ میں سے پھٹ گیا تھا۔ ناند بھی ٹوٹ گئی۔''

ماسونو وہی بات دُہرا رہی تھی جو اُس نے صبح مس اوئیشی کو بتائی تھی۔ اس کی ماں ہونکارے بھرتے ہوئے سر ہلاتی رہی اور پھر بچی اور استانی دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی: ''لوگ بتا رہے تھے کہ کشتیاں اُلٹ گئیں، چھتیں بیٹھ گئیں اور کچھ مکانوں کی دیواریں گر گئیں اور باہر سے سب کچھ نظر آنے لگا۔ میں یہ سن کر ایسی گھبرائی کہ فوراً اس طرف چلی

MashalBooks.com

دی۔ مگر شکر ہے صرف رہٹ کا کھمبا ہی ٹوٹا تھا۔''

اس کے جانے کے بعد مس اوئیشی نے کہا: ''ماہچان، کس کے مکان کی دیواریں ٹوٹی ہیں؟

ماسونو کا انداز پھر پہلے کی طرح پُرغرور لگنے لگا اور وہ اپنے ہاتھ میں اٹھایا ہوا پتھر لڑھکانا تک بھول گئی۔ بولی: ''مس اوئیشی، نیتا کا گھر ٹوٹا ہے! ان کے مکان کی دیواریں گر گئیں اور الماریوں میں پانی بھر گیا۔ میں وہاں دیکھنے گئی تھی۔ گلی میں کھڑے ہوئے مکان کے اندر کی سب چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ نیتا کی دادی الماری کے اندر کی چھت کو دیکھ رہی تھیں، اس طرح!'' یہ کہہ کر اس نے نیتا کی دادی جیسا منہ بنایا جس پر مس اوئیشی کو ہنسی آ گئی۔''

''الماری میں؟ واقعی؟'' وہ بولی۔ اس کے اندر ہنسی کا گولا سا اوپر کو اٹھ رہا تھا، آخر وہ ضبط نہ کر سکی اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ بچوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس طرح کیوں ہنس رہی ہے۔ صرف ماسونو خوش نظر آ رہی تھی کیوں کہ اس نے اپنی استانی کو ہنسا دیا تھا۔ اب وہ چلتے چلتے کونے والی دکان تک آ پہنچے تھے۔ دکان کی مالکہ، جو سخت غصے میں لگ رہی تھی، لپک کر مس اوئیشی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ اس قدر زور زور سے ہانپ رہی تھی کہ کچھ دیر تک کچھ بول نہ سکی۔ مس اوئیشی نے فوراً ہنسنا بند کر دیا اور تعظیم میں جھک کر کہنے لگی: ''اوہ، مجھے معاف کیجئے گا۔ کیسا زوردار طوفان آیا ہے۔ ہم لوگ سڑک پر سے پتھر ہٹا رہے تھے۔''

مگر دوکان کی مالکہ نے یوں ظاہر کیا جیسے یہ بات سنی ہی نہ ہو۔ اس نے سوال کیا: ''استانی صاحبہ، آپ کو ہنسی کس بات پر آ رہی تھی؟''

مس اوئیشی کچھ نہ بولی۔

''لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر ہنس رہی تھیں؟ میرے میاں چھت پر سے گر پڑے۔ یہ بھی ہنسی کی بات ہوگی، کیوں؟ وہ تو انھیں زیادہ چوٹ نہیں آئی، ورنہ اَور زیادہ ہنسی کی بات ہوتی۔ ہَیں؟''

''میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرا یہ مطلب.....''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے! تو پھر دوسروں کی مصیبت پر ہنسنے کا کیا مطلب؟ سڑک کی صفائی کا دکھاوا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کم از کم میرے گھر کے سامنے والی سڑک کو

MashalBooks.com

تو یوں ہی چھوڑ دینا..... ہونھ! سڑک کی صفائی کرائی جا رہی ہے تا کہ سائیکل چلائی جا سکے! احمق کہیں کی! اسے یہ کام خود ہی کرنا ہوگا۔'' یہ آخری فقرے اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر، جیسے اپنے آپ سے کہے اور استانی کو حیرت سے گنگ چھوڑ کر غصے میں وہاں سے چلی گئی۔ پھر وہ برابر والے کاواموتو بڑھئی کی بیوی سے جان بوجھ کر اونچی آواز میں بات کرنے لگی: ''کیسی عورت ہے! استانی ہو کر دوسروں کی مصیبت پر ہنستی ہے، ذرا دیکھو تو سہی! خیر میں نے بھی اسے کھری کھری سنا دیں۔''

یہ بات یقینی تھی کہ یہ قصہ نمک مرچ کے ساتھ ذرا سی دیر میں پورے گاؤں میں پھیل جائے گا۔ مس اوئیشی پریشانی کے عالم میں کوئی دو منٹ تک اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ مگر جب اس کے بچوں کو فکرمندی کے ساتھ اپنے اردگرد کھڑے دیکھا تو وہ اداس سے انداز میں مسکرائی اور کوشش کر کے مسرور آواز میں بولی: ''چلو اَب چلیں۔ غلطی میری ہی تھی۔ چلو سمندر کے کنارے چل کر گیت گاتے ہیں، کیا خیال ہے؟''

وہ مڑی اور بچوں کے آگے آگے چلنے لگی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو بچوں کی تیز نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔

''رو رہی ہیں!''

''بڑی بی نے انھیں رُلا دیا!''

وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے اور پھر چپ ہو گئے۔ اب صرف ان کے چپلوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مس اوئیشی کا جی چاہا کہ مڑ کر، مسکرا کر، بچوں سے کہے: ''میں رو نہیں رہی ہوں،'' مگر پھر اسے آنسو دوبارہ اپنی آنکھوں میں آتے محسوس ہوئے اور وہ خاموش رہی۔ شاید اسے ایک ایسے دن ہنسنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے تھی، اس نے سوچا، مگر وہ کسی کی مصیبت زدگی پر تو نہیں ہنس رہی تھی جیسا دکان کی مالکہ کا کہنا تھا۔ اسے ایک تو ماسونو کے ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے پر ہنسی آ گئی تھی، اور دوسرے ''الماری'' کا لفظ سن کر اسے نیتا کی ایک بات یاد آ گئی تھی جو اس نے پہلی ٹرم کے دوران کلاس میں کہی تھی۔

''بادشاہ کہاں رہتا ہے؟'' اُس روز مس اوئیشی نے کلاس میں سوال کیا تھا۔ کچھ بچوں نے جواب دینے کے لیے ہاتھ کھڑے کیے۔ خلافِ معمول، نیتا بھی ان میں سے ایک تھا، سو اس نے نیتا سے جواب دینے کو کہا۔ اپنی بلند آواز میں، جو لگتا تھا وہ اپنے پورے

بدن کا زور لگا کر نکال رہا تھا، اس نے جواب دیا: بادشاہ الماری میں رہتا ہے۔''

یہ جواب ایسا غیر متوقع تھا کہ مس اوئیشی بے اختیار ہنسنے لگی، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہی نہیں، سب بچے بھی ہنس رہے تھے۔ ان کے زور زور سے ہنسنے سے کلاس روم گونج اٹھا اور ہنسی کی آواز پورے اسکول میں اور اس کے باہر بھی پھیل گئی۔ کچھ بچوں نے سرگوشی میں ''تو کیو'' یا ''شاہی محل'' کہا بھی، مگر نیتا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کچھ دیر بعد جب ہنسی کا شور تھما تو مس اوئیشی نے اس سے پوچھا: ''الماری میں؟ کیا مطلب؟''

اِس بار بچے کی آواز میں پہلی سی خود اعتمادی نہیں تھی۔ ''اَور کیا؟ وہ اسکول کی الماری ہی میں تو رہتا ہے!''

تب اصل بات سب کی سمجھ میں آئی۔ نیتا کی مراد بادشاہ کی تصویر سے تھی۔ چوں کہ ذیلی اسکول میں مندر نہیں تھا اس لیے بادشاہ کی تصویر الماری میں بند رکھی رہتی تھی۔

مس اوئیشی کو نیتا کے گھر کی الماری کا ذکر سن کر یہی واقعہ یاد آ گیا تھا۔ جب کبھی نوجوان استانی کو یہ بات یاد آتی، وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر پاتی تھی۔ مگر ظاہر ہے، یہ بات دکان کی مالکہ کو کیوں کر سمجھائی جا سکتی تھی! وہ چپ چاپ چلتی رہی۔ اب بھی، جبکہ اسے رونا آ رہا تھا، الماری والا واقعہ اسے اُتنا ہی مزے دار معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی مزے دار یاد اس تکلیف دہ احساس کو مٹانے کے لیے کافی نہ تھی جو مالکہ کے کہے ہوئے لفظوں نے اس کے اندر پیدا کیا تھا۔ نہ اس کی سمجھ میں آتا تھا اور نہ بچوں کی، کہ اپنے دل کے بوجھل پن سے کس طرح چھٹکارا پائیں۔ بس ایک ہی ترکیب تھی، کہ ساحل پر جا کر گیت گائے جائیں۔ جوں ہی وہ نیچے اتر کر ساحل پر پہنچے، مس اوئیشی بازوؤں کو چھڑی کی طرح لہرا لہرا کر گیت گانے لگی۔ یہ گیت ایک بے احتیاط حجام کے بارے میں تھا۔

''بہار کے موسم میں
دریا کے کنارے
جہاں سرکنڈے اگتے ہیں.....''

بچے اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے اور خود بھی گانے لگے:

MashalBooks.com

''کیکڑے نے حجام کی دکان کھولی
کھچ کھچ کھچ
کھچ کھچ کھچ
خرگوش بال کٹوانے آیا
کھچ کھچ کھچ
کھچ کھچ کھچ
کیکڑے کی قینچی سے
اپنا کان کٹوا بیٹھا
کھچ کھچ کھچ
کھچ کھچ کھچ.....''

گیت گاتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ خوش ہونے لگے۔

''خرگوش غصّے میں بھاگا
کھچ کھچ کھچ
کھچ کھچ کھچ
کیکڑا بھی بھاگا
اپنے بِل میں چھپ گیا''

گیت پورا ہونے سے پہلے پہلے مس اوئیشی نے خود کو دوبارہ دل کھول کر ہنستے ہوئے پایا۔ گیت والے کیکڑے نے اسے خوش کر دیا تھا، کیوں کہ وہ بھی اُسی کی طرح بے احتیاط تھا اور خود کو مشکل میں پھنسا بیٹھا تھا۔

انھوں نے باری باری وہ سب گیت گائے جو پہلی ٹرم میں سیکھے تھے، جیسے ''یہ سڑک'' اور ''بارش کا پرندہ''۔ جب وہ ''پہاڑی کا مالک'' گا چکے تو گانے میں وقفہ کیا گیا اور بچے اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ ان میں سے لڑکیاں بالوں میں کنگھی نہیں کرتی تھیں بلکہ چھوٹے کٹے ہوئے تھے، اب اتنے بڑھ آئے تھے کہ کانوں کو تقریباً چھپا لیا تھا۔ گاؤں میں حجام کی کوئی دکان نہیں تھی، اس لیے اسکول میں رکھی ہوئی بال کاٹنے کی قینچی بہت کارآمد ثابت ہوتی تھی۔ ماسٹر صاحب کے کام میں لڑکوں کے بال کاٹنا بھی شامل تھا۔ رہے لڑکیوں کے بھدّے جُوڑے، تو ان کی دیکھ بھال استانی کی ذمے داری تھی۔ وہی ان

کے سروں پر تیل کی مالش کرتی۔ اس نے اگلے روز اپنی یہ ذمے داری پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بچوں سے بولی: ''چلو بھئی، آج کا وقت ختم۔ آؤ اب چلیں۔''

اس نے گھٹنوں پر سے اپنے اسکرٹ کو جھاڑا اور الٹے قدموں بچوں کے آگے آگے چلنے لگی۔ اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، وہ ریت کے گڑھے میں جا گری تھی۔ کچھ بچے اس کے ساتھ ساتھ چیخنے لگے، کچھ کو ہنسی آنے لگی، کچھ بچوں نے تالیاں بجائیں اور کچھ اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ اس تمام شور وغل میں مس اوئیشی نے کھڑے ہونے کی کوشش نہ کی۔ وہ ریت پر کروٹ کے بل لیٹ گئی اور اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں۔ اس کے بال ریت کو چھونے لگے۔ ہنسنے اور تالیاں بجانے والے بچے خاموش ہو گئے۔ ان سب کو احساس ہوا کہ کوئی غلط بات پیش آ گئی ہے۔ استانی کی بند آنکھوں میں سے بہتے آنسو دیکھ کر سانائے یا مالیشی اچانک رو پڑی۔ مس اوئیشی نے بچی کے رونے کی آواز سے حوصلہ پا کر کہا: ''میں ٹھیک ہوں،'' اور زور لگا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے گڑھے کے اندر اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور بڑی احتیاط سے اپنے جوتے اتارنے لگی۔ مگر جوں ہی اس کا ہاتھ گھٹنے سے مس ہوا، وہ دوبارہ گر پڑی۔ اب کے اس نے اٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ تکلیف سے آنکھیں بند کیے کیے بولی: ''تم میں سے کوئی جا کر ماسٹر صاحب کو بلا لائے گا؟ ان سے کہنا میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، میں چل نہیں سکتی۔''

بچوں نے ایک دم شور مچا دیا۔ بڑے لڑکے تو ماسٹر صاحب کو بلانے کے لیے دوڑ پڑے اور لڑکیاں زور زور سے رونے لگیں۔ گاؤں کے لوگ، جیسے آگ لگنے کی گھنٹی سن کر، اپنے گھروں سے نکل نکل کر ساحل کی طرف دوڑنے لگے۔ سب سے پہلے تاکے اِیچی کا باپ پہنچا اور مس اوئیشی کی طرف بڑھا جو اوندھے منہ ریت پر پڑی تھی۔ وہ ریت پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولا: ''کیا بات ہے مس اوئیشی؟'' اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ لیکن استانی جس کا چہرہ اذّیت سے کھنچا ہوا تھا، کچھ جواب نہ دے سکی۔ بچوں نے اسے بتایا کہ مس اوئیشی کی ٹانگ میں چوٹ لگی ہے۔ یہ سن کر وہ کچھ پُرسکون نظر آنے لگا اور بولا: ''پنڈلی میں موچ آ گئی ہوگی۔ لاؤ مجھے دکھاؤ۔'' مس اوئیشی کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور چہرے پر تکلیف کے آثار اور گہرے ہو گئے۔ اس کی پنڈلی سُوج کر اپنے ناپ سے دگنی ہو گئی تھی۔ جہاں پہلے جوتے کا بند بندھا ہوا تھا وہاں جلد پر ایک واضح نشان تھا، مگر خون نہیں نکل رہا

تھا۔

''میرا خیال ہے ٹانگ کی ٹھنڈی مالش کرنی ہوگی،'' تاکے اِیچی کے باپ نے لوگوں کی بھیڑ سے مخاطب ہوکر کہا جو ساحل پر جمع ہوگئی تھی۔ کیچی جی تو کودا کا باپ لپک کر گیا اور اپنا میلا تولیا سمندر کے پانی سے گیلا کر کے لے آیا۔

ماسٹر صاحب بھی جلدی جلدی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے پوچھا: ''کیا بہت زیادہ تکلیف ہے؟''

مس اوئیشی نے صرف ہاں میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم چل سکتی ہو؟'' انھوں نے پھر پوچھا۔ اب کے اسنے انکار میں سر ہلایا۔

''بہر حال، اٹھنے کی کوشش تو کرو!''

استانی اپنی جگہ ساکت پڑی رہی۔ میسا کو نیشی گوچی کی ماں اپنے گھر سے کپڑے کی بنی ایک چھوٹی سی گدی پر آٹے اور انڈے کی پُلٹس لگا کر لے آئی۔

''میرا خیال ہے ہڈی نہیں ٹوٹی ہے، لیکن کسی ڈاکٹر یا جراح کو فوراً دکھا لینا چاہیئے۔''

''کوسادانا کا ماچی میں سب سے اچھا جراح ہے۔ وہ ہڈیاں بٹھانے کا بھی ماہر ہے۔''

''میری رائے میں تو ڈاکٹر ہاشی موتو کے پاس جانا چاہیے۔''

مختلف لوگ مختلف تجویزیں دے رہے تھے۔ لیکن جہاں تک راس والے گاؤں کا تعلق ہے یہاں نہ کوئی جراح تھا نہ ڈاکٹر۔ بہر حال، ایک بات صاف تھی: مس اوئیشی کے لیے چل کر جانا ممکن نہیں تھا۔ بہت دیر کے بحث مباحثے کے بعد انھوں نے اسے کشتی میں ناکاماچی لے جانے کا فیصلہ کیا۔ کوتسورو کا بے کے باپ اور تاکے اِیچی کے بھائی نے پیش کش کی کہ وہ اسے تاداشی کے ماہی گیر باپ کی چپوؤں والی کشتی میں لے جائیں گے۔ ماسٹر صاحب نے، جنھیں کشتی میں ساتھ جانا تھا، مس اوئیشی کو پیٹھ پر اٹھا لیا۔ اٹھائے جاتے اور کشتی میں دوبارہ لٹائے جاتے وقت مس اوئیشی بہت ضبط کرنے پر بھی بے اختیار کراہنے لگی۔

جب کشتی ساحل سے دور ہونے لگی تو لڑکیوں نے بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا:

''استانی!''

''استانی صاحبہ!'' کچھ بچے پوری طاقت سے چلائے۔ مس اوئیشی کے لیے ذرا بھی ہلنا جلنا ناممکن تھا۔ وہ خاموش، آنکھیں بند کیے پڑی یہ آوازیں سنتی رہی۔

''استانی!''

بچوں کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور کشتی کھاڑی میں کافی آگے نکل آئی۔ وہ اپنا درد جھیلتی، کھاڑی کے اُس پار جا رہی تھی جہاں آج ہی صبح اُس نے اپنے تصوّر میں جادو کا پُل بنایا تھا۔

MashalBooks.com

پانچ مٹھی چاول، ایک مٹھی دانے

دس دن گزر گئے۔ آدھا مہینا گزر گیا۔ مگر مس اوئیشی اسکول واپس نہ آئی۔ اس کی سائیکل پر جو اسٹاف روم کی دیوار سے ٹکی کھڑی تھی، گرد جمتی گئی۔ کبھی کبھار بچے اداس چہرے لیے اس کے پاس آ کھڑے ہوتے۔ کچھ بچوں کا خیال تھا کہ مس اوئیشی اب کبھی نہیں آئیں گی۔ اس کے غائب ہو جانے پر بڑے اسکول جانے والے بچوں کو بھی مایوسی تھی۔ اس سے مڈبھیڑ نہ ہونے پر انھیں اندازہ ہوا کہ اسکی سائیکل سے انھیں کتنی مدد ملتی تھی اور وہ لمبے راستے میں اسے آتا دیکھنے کے کس قدر مشتاق رہتے تھے۔ گاؤں والے بھی اس کی غیر موجودگی کو محسوس کرنے لگے۔ انھیں دل ہی دل میں افسوس ہونے لگا کہ انھوں نے اس سے کچھ زیادہ دوستانہ برتاؤ نہیں کیا تھا، اگرچہ یہ بات بھی تھی کہ کسی نے اس سے کوئی خاص بُرا سلوک بھی نہ کیا تھا۔ اچانک وہ مس اوئیشی کا ذکر اچھے الفاظ میں کرنے لگے۔

''ایسی استانی پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ بچے شروع ہی میں اس سے مانوس ہو گئے تھے۔''

''خدا کرے وہ جلدی ٹھیک ہو جائے۔ اگر وہ ہمارے بچوں کی وجہ سے معذور ہو گئی تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ اور پھر ہمیں نئی استانی بھی آسانی سے کہاں ملے گی۔''

''ارے نہیں، وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ویسے اگر اس عمر میں اپاہج ہو گئی تو بہت بُری بات ہوگی۔ پھر وہ اسکول کیسے پہنچا کرے گی؟''

اور یوں وہ استانی کا ذکر کرتے رہتے۔ یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ وہ سب استانی کے لوٹ آنے کے خواہش مند ہیں، اور اگر وہ واپس نہ آئی تو واقعی بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اس کی غیر موجودگی سے سب سے زیادہ مشکل ماسٹر صاحب کو ہو رہی تھی۔ گاؤں کے اس چھوٹے سے اسکول میں ہفتے میں ایک بار موسیقی کا سبق دیا جاتا تھا۔ مگر یہ

MashalBooks.com

ہفتے میں ایک بار، ایک گھنٹے کا پیریڈ بھی ماسٹر صاحب کے لیے بہت دشوار کام تھا۔ جب استانی نے اسکول آنا چھوڑا تو پہلے پہل وہ بچوں سے کہہ دیتے کہ وہ ملکر اپنے اب تک کے یاد کیے ہوئے گیت گایا کریں، اور ان میں سے جن کی آواز اچھی ہو وہ باقی بچوں کو گیت گا کر سنایا کریں۔ تقریباً ایک مہینا اسی طرح گزرا۔ مگر معاملے کو یوں کب تک ٹالا جا سکتا تھا۔ آخر انھوں نے آرگن بجانا سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ واقعی مشکل کام تھا۔ وہ اونچی آواز میں ''دُو دُو دُو رے می می می، سول سول سول لا سول سول سول..... کی جگہ ''ایک ایک دو تین تین تین، پانچ پانچ پانچ چھ پانچ پانچ پانچ.....'' گایا کرتے، کیوں کہ پرائمری اسکول میں انھوں نے اسی طرح سیکھا تھا۔ ''تین تین تین دو تین تین تین، ایک ایک دو تین ایک ایک ایک،'' وہ یوں ہی مشق کرتے رہے۔

ہر سنیچر کو تیسرا پیریڈ موسیقی کا ہوتا تھا۔ یہ پیریڈ ہفتے کے آخری دن اس لیے رکھا گیا تھا کہ بچے موسیقی سے تازہ دم ہو جائیں اور ان کی ہفتہ وار چھٹی اچھی طرح گزرے۔ مگر اچانک موسیقی کا سبق بچوں اور استاد دونوں کے لیے اپنی کشش کھو بیٹھا۔ بلکہ ماسٹر صاحب کا حال زیادہ بُرا تھا۔ جمعرات ہی سے انھیں سنیچر کے تیسرے پیریڈ کا سوچ سوچ کر ہَول اٹھنے لگتا۔ وہ چڑچڑے ہو جاتے اور اپنا غصہ شاگردوں پر اتارنے لگتے۔ کوئی بچہ کلاس میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تو اسے ڈانٹ دیتے، یا کوئی گھر سے کچھ لانا بھول جاتا تو اسے سزا کے طور پر کلاس کی پچھلی دیوار کے پاس کھڑا کر دیتے۔

''ماسٹر صاحب کو آج کل بہت غصہ آنے لگا ہے۔ ہے نا؟''

''بہت ڈانٹتے ہیں۔ آخر انھیں ہوا کیا ہے؟''

بچے تو اندازہ لگانے کی کوشش ہی کرتے رہے، مگر ماسٹر صاحب کی بیگم معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ وہ اندر ہی اندر فکر میں گھل رہی تھیں اور کسی نہ کسی طرح اپنے شوہر کی مدد کرنا چاہتی تھیں۔ جمعے کے دن، وہ اپنا تنکوں کی بُنائی کا جز وقتی کام روک کر آرگن کے پاس آ کھڑی ہوتیں اور مشق کرنے میں ماسٹر صاحب کے ہمت بڑھایا کرتیں۔

''چلو، میں تمھاری شاگرد بن جاتی ہوں۔''

''اچھا؟ واقعی؟''

جھلملاتی روشنی میں آرگن کے پاس دونوں میاں بیوی کو کھڑے دیکھنا ایسا عجیب نظارہ تھا کہ کوئی بچی اگر دیکھتی تو ڈر جاتی۔ ماسٹر صاحب اور ان کی بیگم نیم تاریکی میں گانے

کی مشق کیا کرتے: ''ایک ایک ایک دو تین تین تین، پانچ پانچ پانچ چھ پانچ.....''

جب تک ماسٹر صاحب آرگن پر اپنی بیگم کی آواز کا ساتھ دینے کے قابل ہوئے، رات کافی گزر چکی تھی۔ گاؤں کے لوگ کب کے سو چکے تھے۔ بیگم نے اس خیال سے کہ کسی کی نیند خراب نہ ہو، تیل کا چراغ بجھا دیا، ٹٹولتے ہوئے کمرے میں پہنچ کر ایک آہ بھری اور اپنے شوہر سے سرگوشی میں کہنے لگیں: ''استانی کے نہ آنے سے ہمیں کتنی مشکل ہو گئی ہے۔''

''ہاں، لیکن اصل مشکل تو خود اُسے ہو رہی ہے۔''

''یہ تو سچ ہے۔ آرگن کی مشق کرنا کہاں اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ کہاں۔''

''ہوسکتا ہے مس اوئیشی اب واپس ہی نہ آئے۔ وہ خود تو برہم نہیں تھی لیکن اس کی ماں بہت سخت غصے میں تھی۔ کہنے لگی: میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اب میں اسے تمھارے گاؤں میں ہرگز نہیں بھیجوں گی۔ کیسے لوگ ہیں اس گاؤں کے!''

''اس کا غصے میں آنا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن اگر مس اوئیشی نہیں آئی تو اس کی جگہ کوئی اور اُستانی آئے گی۔''

ماسٹر صاحب کی بیگم یوں سرگوشی کر رہی تھیں جیسے انھیں اندیشہ ہو کہ کوئی ان کی باتیں سن لے گا، اور بات کرتے ہوئے کھاڑی کے اُس پار ملامت بھرے انداز میں دیکھتی جاتی تھیں۔ صنوبر والا گاؤں بھی سکون کی نیند میں لگتا تھا، صرف چند بتّیاں ٹمٹما رہی تھیں جو دور سے ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے آسمان میں جھلملاتے تارے۔ انھیں لگا کہ وہ خود اور ان کے شوہر ہی دو ایسے نفوس ہیں جو اتنی دیر تک جاگ رہے ہیں اور اتنی محنت سے کام میں مصروف ہیں۔ انھیں استانی کی طرف سے رنج محسوس ہونے لگا۔

اُس حادثے کے بعد سے ماسٹر صاحب کی بیگم اسکول کے کام میں بھی اُن کا ہاتھ بٹانے لگی تھیں اور چوتھی کلاس کی بچیوں کو سینا پرونا سکھاتی تھیں۔ یہ کام زیادہ تر فرش کے غلاف تیار کرنے پر مشتمل تھا جس میں کوئی خاص دشواری نہ ہوتی تھی۔ اُنھیں بس کلاس کے دوران نگرانی کرنی ہوتی تھی اور لڑکیاں باری باری اپنے حصے کا کام اتنی احتیاط سے کرتیں جیسے دھاگوں کے گولے پر نقش و نگار بنا رہی ہوں۔ مگر موسیقی کے سبق کی بات دوسری تھی کیوں کہ آرگن بجانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس میں سینے پرونے سے کہیں زیادہ ہنر درکار تھا۔ وہ اپنے شوہر کو یہ ہنر سیکھنے میں اتنی سخت مشقت کرتے دیکھ کر ہیبت زدہ ہوگئی

تھیں۔ اکتوبر شروع ہو گیا مگر اب بھی ماسٹر آرگن پر مشق کرتے ہوئے پسینے پسینے ہو جاتے تھے۔ انھیں اس وجہ سے اور بھی پسینہ آتا کہ کمرے کی کھڑکیاں بند رکھی جاتی تھیں تا کہ آواز باہر نہ جائے۔

استاد ہونے کی حیثیت سے انھیں آرگن بجانا آنا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے صرف پرائمری اسکول تک باقاعدہ تعلیم پائی تھی اور باقی صرف اپنی ذاتی کوشش سے پڑھ کر استاد بنے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ وہ آرگن بجانا بالکل نہ جانتے تھے۔ عام دیہی اسکولوں میں موسیقی کی تعلیم کے لئے کوئی الگ استاد نہیں رکھا جاتا تھا، اور عام استادوں ہی سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ بچوں کو موسیقی اور جمناسٹک کی تربیت دے سکیں گے۔ لیکن اس اسکول میں موسیقی سکھانے کی پوری ذمے داری نوجوان استانی کے حصے میں آتی تھی۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ ماسٹر صاحب اس دور اُفتادہ راس کے اسکول میں آنے پر راضی ہو گئے تھے۔ انھیں جھجھلاہٹ ہونے لگتی کہ اب انھیں آرگن بجانا سیکھنا پڑ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اتنے غصے میں آجاتے کہ انکا دل کرتا کہ آرگن کو توڑ کر پھینک دیں۔

مگر آج رات یہ بات نہ تھی۔ اب وہ اس سطح تک پہنچ گئے تھے کہ گانے کے ساتھ ساتھ سنگت کر سکتے تھے، خواہ وہ ان کی بیگم ہی کا گانا کیوں نہ ہو۔ ماسٹر صاحب کے دل اس وقت ہلکا تھا اور وہ کچھ کچھ فخر کے لہجے میں اپنی بیگم سے کہہ رہے تھے: ''اگر میں دل لگا کر کوشش کروں تو آرگن بجانا سیکھ سکتا ہوں۔''

ان کی بیگم نے فوراً تائید میں سر ہلایا اور بولیں: ''بالکل بالکل، میں جانتی ہوں۔''

اگلے دن کی موسیقی کی کلاس میں اوئیشی کے جانے کے بعد سے چھٹی کلاس تھی۔ ماسٹر صاحب تقریباً اشتیاق سے اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ بچے حیران رہ جائیں گے۔''

''مجھے بھی یقین ہے۔ جب وہ تمھیں آرگن بجاتے سنیں گے تو انھیں اچھا لگے گا۔''

''بالکل۔ اب ان کے باقاعدہ سنجیدہ گیت سیکھنے کا وقت ہے۔ مس اوئیشی تو انھیں بے وقوفی کی چیزیں سکھاتی رہی۔ بارش کا پرندہ اور کھچ کھچ کھچ، اور پتہ نہیں کیا کیا۔ سب ایسے احمقانہ گیت جو بَون ملے کے ناچوں میں گائے جاتے ہیں۔''

MashalBooks.com

''مگر بچوں کو تو پسند ہیں۔''

''واقعی؟ لڑکیوں کے لیے تو خیر ٹھیک ہیں، مگر لڑکوں کے لیے بالکل مناسب نہیں۔ اب وقت ہے کہ میں انھیں ایسے گیت سکھاؤں جن سے ان میں جاپانی روح بیدار ہو سکے۔ آخر صرف لڑکیاں ہی تو نہیں پڑھتیں ہمارے اسکول میں۔''

انھوں نے اپنا سینہ پھلایا اور گویا عادت کے مطابق، بیگم کو وہ گیت گا کر سنانے لگے جس کی مشق انھوں نے ابھی ابھی پوری کی تھی۔

''بڑی بڑی چٹانیں اتنی بھاری نہیں.....''

ان کی بیگم نے انھیں روک دیا، بولیں: ''شش! اگر کسی نے سن لیا تو سمجھے گا کہ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔''

آخر خدا خدا کر کے اگلا دن آیا، اور موسیقی کے سبق کا وقت شروع ہوا۔ بچے بہت مرے مرے قدموں سے کلاس روم کی طرف چلے۔ ان کے قدم غالباً اس خیال سے بھاری ہو رہے تھے کہ آج بھی ان سے، آرگن کے بغیر، پرانے سیکھے ہوئے گیت گانے کو کہا جائے گا۔

مس اوئیشی سینچر کو دوسرا پیریڈ ختم ہوتے ہی موسیقی کی کلاس میں پہنچ جاتی اور آرگن پر مشق شروع کر دیتی۔ جب لکڑی کی تختی پر دستک دے کر تیسرے پیریڈ کے شروع ہونے کا اعلان ہوتا اور بچے کلاس کی طرف چلتے تو وہ انھیں جوش میں لانے کے لیے مارچ کی دُھن بجانا شروع کر دیتی، اور وہ غیر ارادی طور پر کلاس کی طرف تیز تیز قدم بڑھانے لگتے۔ کتنا مزہ آتا تھا، حالاں کہ بچوں کو اس مزے کے سبب کا اُس وقت کوئی خاص شعور نہ تھا۔ مگر اَب، جب مس اوئیشی نہیں تھی، ان کے دلوں میں ایک طرح کی بے اطمینانی نے جگہ بنالی تھی، اور وہ اس بے اطمینانی کے سبب سے بھی پوری طرح واقف نہ تھے۔

''تم لوگ اپنے سیکھے ہوئے گیت گاؤ۔ میں صرف سنوں گا،'' ماسٹر صاحب آج پھر یہی کہیں گے اور آرگن کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ لیکن بچوں کو آرگن کی سنگت کے بغیر گانا شروع کرنے میں بڑی مشکل پڑتی تھی۔ پھر وہ جب گانا شروع بھی کر دیتے تو اکثر بے سُرے ہو جاتے۔

مگر آج ذرا مختلف بات ہوئی۔ جب بچے کلاس روم میں داخل ہوئے تو انھوں نے ماسٹر صاحب کو پہلے سے آرگن کے پاس بیٹھے دیکھا۔ وہ آرگن کے پردوں کو بالکل

MashalBooks.com

ویسے تو نہیں چھو رہے تھے جیسے مس اوئیشی چھوتی تھیں۔لیکن بحر حال انہوں نے آرگن سے ایک آدھ آواز نکالی جس سے بچوں کو آداب کہنے کا اشارہ ملا۔بچوں کے چہروں پر حیرانی کا تاثر تھا۔جیسا کہ مس اوئیشی کا طریقہ تھا، ماسٹر صاحب نے بھی آج کے گیت کی موسیقی کو داہنے بلیک بورڈ پر لکھ دیا تھا اور اس کے الفاظ کو بائیں بلیک بورڈ پر۔

''بڑی چٹانیں۔''

بڑی بڑی چٹانیں اتنی بھاری نہیں
جتنا ہمارا قومی فرض
جب جنگ ہو تو ہمیں آگے بڑھنا ہے
تیروں اور گولیوں کو سینے پر لیتے ہوئے
ہمیں آگے ہی آگے بڑھنا ہے
ہمیں اپنے ملک کے لیے
اپنی جان قربان کرنی ہے۔

چینی حروفِ تہجی کے ساتھ ساتھ ان کا تلفظ بھی لکھا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب آرگن کے پاس سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر آ کھڑے ہوئے۔جیسا کہ دوسرے مضامین پڑھاتے ہوئے ان کا طریقہ تھا، انھوں نے بانس کی چھڑی اٹھائی اور ایک ایک لفظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گیت کے معنی سمجھانے لگے۔ یہ گیت بالکل اخلاقیات کے سبق کی طرح تھا۔ انھوں نے اس گیت کے گہرے معنی کی بار بار وضاحت کی، مگر اکثر بچوں کی سمجھ میں کچھ خاص نہ آیا۔سب سے پہلے پہلی کلاس کے بھی کچھ بچوں نے سرگوشیوں میں باتیں شروع کر دیں۔ پھر ایک دم بڑے زور کی آواز ہوئی۔ ماسٹر صاحب نے اپنی چھڑی بہت زور سے ڈیسک پر ماری تھی۔ بچے فوراً خاموش ہو گئے اور بڑی بڑی، گول گول آنکھوں سے ماسٹر صاحب تیز، مگر پھر بھی قدرے نرم، لہجے میں بولے: ''مس اوئیشی شاید کچھ عرصے اور اسکول نہ آسکیں۔آج کے بعد سے تم لوگوں کو موسیقی میں سکھاؤں گا۔ جو گیت میں تمھیں سکھاؤں تمھیں ان کو یاد کرنا ہوگا۔''

پھر وہ آرگن کے قریب گئے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔لگتا تھا کہ وہ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔مگر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ آرگن پر بیٹھ کر انھوں نے گانا شروع

کر دیا۔

''ایک ایک ایک دو تین تین تین، پانچ پانچ پانچ چھ پانچ، سب مل کر گاؤ!''

بچے قہقہے مار کر ہنسنے لگے: کیوں کہ ماسٹر صاحب بہت پُرانے طریقے سے گا رہے تھے۔ لیکن کوئی ان پر کتنا بھی ہنسے، اُن کے لیے اس عمر میں نیا طریقہ اختیار کرنا نا ممکن تھا۔ سو آخر کار انھوں نے سُر چھیڑے اور بچوں کو اپنے طریقے سے سکھانا شروع کیا۔ بچے کو یہ طریقہ بڑا مزے دار لگا۔

''تین تین تین تین دو دو دو، ایک ایک دو تین ایک، دو دو دو دو ایک تین پانچ، پانچ پانچ پانچ پانچ چھ پانچ تین.....''

یہ گردان کرتے ہوئے بچے پاگل ریاضی داں لگ رہے تھے۔ مگر وہ سب گانے کی دُھن دُہرانے کا یہ عجیب وغریب طریقہ فوراً سیکھ گئے، اور یہ طریقہ اس دن کے بعد سے انھیں بہت پسند آنے لگا۔ کوئی بچہ ماسٹر صاحب کو خوش کرنے کے لیے اصل گیت کے متاثر کن الفاظ ادا نہ کرتا۔ گیت کے لفظوں کے بجائے وہ سب خوش ہو ہو کر اسی دُھن میں ''پانچ پانچ پانچ پانچ چھ پانچ تین'' گایا کرتے۔

چند ہفتے بعد ایک سنیچر کو بچے اسکول میں وہی ''بڑی چٹانوں'' والا گیت گانے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ پہلی کلاس کی ماسونو نے اپنے ساتھ چلتی بچی سانائے سے سرگوشی کی: ''مجھے ماسٹر صاحب کی موسیقی کی کلاس بالکل اچھی نہیں لگتی۔ مجھے تو استانی صاحبہ کی کلاس میں مزہ آتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک گیت گانے لگی جو مس اوئیشی نے بچوں کو سکھایا تھا۔

''ایک پہاڑی کوّا
میرے واسطے لایا.....''

سانائے اور کوتسورو بھی اس کی آواز میں آواز ملانے لگے:

''چھوٹا سُرخ لفافہ''

ان کے آس پاس پہلی کلاس کی بچیاں چل رہی تھیں جن کی دوپہر کے بعد کوئی کلاس نہیں ہوتی تھی۔

''پتا نہیں استانی صاحبہ کب واپس آئیں گی،'' تاسونو نے دور صنوبر کے پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب بچیاں اُسی سمت میں دیکھنے لگیں۔

MashalBooks.com

''میں بھی ان سے ملنا چاہتی ہوں،'' کوتسورو بولی۔

اتنے میں ایسو کیچی اور کیچی جی بھی اُن سے آملے اور ان کی بات دُہرانے لگے:

''میں بھی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'' یہ الفاظ منہ سے نکلتے ہی انھیں یقین ہو گیا کہ وہ سب واقعی مس اوئیشی سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ سب رک گئے اور صنوبر کی طرف دیکھنے لگے۔

''استانی صاحبہ اسپتال میں ہیں،'' ایسو کیچی نے جو کچھ بڑوں سے سنا تھا وہ دُہرا دیا۔ مگر کوتسورو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔

''نہیں، اسپتال میں تو پہلے تھیں۔ اب تو چلی بھی گئیں اسپتال سے۔ میرے ابّا کل بتا رہے تھے کہ وہ سڑک پر ان سے ملے تھے۔''

شاید یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلی کوتسورو ہی بولی تھی کہ وہ مس اوئیشی سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کا باپ، ''گھنٹی والا''، گاؤں والوں کے مختلف کاموں سے پیدل اور کشتی پر آتا جاتا رہتا تھا۔ پچھلے دن وہ اپنی گاڑی پر قصبے میں گیا تھا۔ اسے لوگوں کے کاموں سے ہر دوسرے تیسرے دن قصبے جانا ہوتا تھا، اور وہاں سے وہ نہ صرف بہت سی چیزیں اپنی گاڑی پر لاد کر لایا بلکہ قسم قسم کی خبریں بھی لاتا۔ مس اوئیشی کے بارے میں بھی ''گھنٹی والے'' ہی کو اپنے آنے جانے کے دوران خبریں ہاتھ آتی تھیں..... کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، وہ کئی مہینوں تک چلنے کے قابل نہیں ہوگی، وغیرہ وغیرہ..... اور اُسی نے یہ خبریں اپنی پیٹی کے ساتھ بندھی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ گاؤں والوں تک پہنچائی تھیں۔

''پھر تو وہ آنے ہی والی ہوں گی، ہے نا؟ کاش جلدی سے آجائیں،'' سانائے بولی۔ اُس کی آنکھیں امید کی چمک سے روشن تھیں۔ کوتسورو نے پھر اس کی بات کی تردید کی: ''ابھی کیسے آسکتی ہیں؟ ابھی تو ان سے کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔'' پھر اس نے تجویز پیش کی: ''کیوں نہ ہم سب اُن کے گھر چلیں!'' اور پھر باری باری سب کا منہ دیکھنے لگی۔ تب تک تاکے اِچی، تاداشی اور نیتا بھی ان کیساتھ شامل ہو چکے تھے۔ مگر بچوں نے کوتسورو کی تجویز پر فوراً صاد نہیں کیا۔ وہ بس خاموشی سے صنوبر کو تکتے رہے، کیوں کہ انھیں کچھ پتا نہیں تھا کہ مس اوئیشی کا گاؤں کتنی دور ہے۔ انھوں نے سن رکھا تھا کہ وہ ان کے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے، یا دو رائی، جیسا کہ بڑے لوگ کہا کرتے تھے۔ لیکن پہلی کلاس کے بچوں کو کہیں آنے جانے کا کچھ تجربہ نہ تھا، اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ یہ فاصلہ دراصل کتنا ہوتا ہے۔ کیا پتہ استانی کا گاؤں بہت دور ہو، مگر صنوبر تو بالکل کھاڑی کے اُس

پار دکھائی دے رہا تھا۔ انھیں اصل میں ایک فکر ستا رہی تھی: کہ مس اوئیشی کا گاؤں اُوجی گامی مندر سے بھی آگے ہے۔ وہ کبھی صنوبر کے پاس تک چل کر نہیں گئے تھے۔ لیکن مندر تک سالانہ تہوار کے موقعوں پر، پیدل یا کشتی پر، کئی بار جا چکے تھے۔ صنوبر والا گاؤں مندر سے کتنا آگے ہے، یہ کوئی بھی یقین سے نہ کہہ سکتا تھا۔ صرف نیتا ایسا تھا جو پچھلے دنوں اس سے بھی آگے، قصبے تک، ہو کر آیا تھا۔ مگر اس سفر میں وہ مندر کے پاس سے بس میں بیٹھ گیا تھا اور بس ہی میں صنوبر کے پیڑ کے پاس سے گزرا تھا۔ پھر بھی سب بچوں نے نیتا کو گھیر لیا۔

''نیتا، مندر سے صنوبر والے گاؤں تک پہنچنے میں کتنے گھنٹے لگے تھے؟''

''بس تھوڑی سی دیر لگی تھی، پیڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے بس نے زور سے ہارن بجایا تھا۔ میں نے اُس وقت تک اپنا بَن بھی ختم نہیں کیا تھا۔''

''جھوٹا کہیں کا! بن کھانے میں تو بس ایک منٹ لگتا ہے،'' تاکے ایچی بولا۔

ماتسوائے اپنی بات کی تائید حاصل کرنے کے لیے میسا کو کی طرف مڑی۔ ''مجھے پتا ہے، بسیں بہت تیز چلتی ہیں، مگر ایک منٹ میں تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ہے نا؟''

سب بچوں کی بے اعتباری پر نیتا کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ بولا: ''مگر میں نے مندر کے سامنے بس میں بیٹھ کر بن کھانا شروع کیا تھا، اور بس سے اترنے تک بن میرے ہاتھ میں تھا۔''

''واقعی؟''

''اَور کیا؟''

''قسم کھاؤ۔''

''قسم سے!

آخر کار سب کو اس کی بات پر یقین آ گیا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ نیتا بس میں پہلی بار سفر کرنے پر اس قدر پُر جوش تھا کہ اس کی نظریں مستقل ڈرائیور کی حرکات پر لگی رہیں اور وہ بن کھانا بالکل بھول گیا تھا۔ لیکن یہ خیال بچوں میں سے کسی کو نہ آیا۔ انھوں نے یہی سمجھا کہ مندر سے صنوبر تک پہنچنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے، کیوں کہ نیتا جو بس کا سفر کر چکا تھا، اس کا یہی کہنا تھا کہ بن ختم کرنے سے پہلے ہی وہ قصبے تک پہنچ چکا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مس اوئیشی اپنے گاؤں سے سائیکل پر سوار ہو کر اسکول آتی تھیں، مگر دیکھا نہیں کہ وہ ہر صبح کتنی جلدی پہنچ جاتی تھیں؟ سائیکل کی سواری سے بچوں کو فاصلے کے زیادہ ہونے کے بجائے کم ہونے

MashalBooks.com

کا گمان ہوا۔ پھر ایک فیصلہ کن بات اَور بھی ہوئی: انھوں نے کھاڑی کے دوسرے کنارے پر ایک بس کو گزرتے دیکھا۔ وہ بالکل کھلونے جیسی دکھائی دے رہی تھی اور پلک جھپکتے میں جنگل میں غائب ہوگئی۔

''چلو چلتے ہیں!'' ماسونو نے اپنی اونچی، پُر جوش آواز میں کہا، جس سے لڑکے بھی حیرت انگیز طور پر متاثر ہوگئے۔

تاداشی اور تاکے ایچی نے فوراً اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''چلو!''

''ٹھیک ہے، چلو!''

کوتسورو اور ماتسوئے خوشی کے مارے اچھلنے لگیں۔

''چلو، بھاگتے ہوئے جائیں اور بھاگتے ہوئے واپس آئیں!''

''ہاں، ہاں، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!''

صرف سانائے اور کوتوئے خاموش رہیں۔ سانائے اس لیے چپ رہی کہ وہ فطری طور پر کم گو تھی۔ جبکہ کوتوئے کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اسے شاید اپنے گھر کا خیال آ رہا ہوگا۔

''کوتوئے، تم نہیں چلو گی؟'' کوتسورو نے اس انداز میں کہا جیسے اُسے ملامت کر رہی ہو۔ کوتوئے اَور بھی بے چین نظر آنے لگی اور بولی: ''میں پہلے دادی امّاں سے پوچھوں گی۔''

اُس کی دھیمی سی آواز میں اعتماد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ابھی پہلی ہی کلاس میں تھی مگر اس کے چار چھوٹے بہن بھائی تھے، اور چوں کہ وہ سب سے بڑی تھی اس لیے ان میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت اس کی پیٹھ پر سوار رہتا تھا۔ اس نے تقریباً تین برس کی عمر سے ننھے بچوں کی دیکھ بھال کا کام شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ گھر جا کر اپنے گھر والوں سے اجازت مانگتی تو اسے ہرگز اجازت نہ ملتی۔ یہی حال سانائے، ماتسوئے اور کوتسورو کا بھی تھا۔ کچھ دیر تک وہ چاروں ایک دوسرے کو حوصلہ شکن نظروں سے دیکھتی رہیں۔ گاؤں کا ایک پُرانا اَن لکھا رواج تھا کہ بچے آٹھ نو برس کی عمر تک کھیل کود میں وقت گزار سکتے ہیں۔ لیکن کھیل کود کے دوران بھی انھیں سب کچھ اپنی مرضی سے کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یا تو انھیں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو اپنے ساتھ رکھنا ہوتا یا شیر خواروں کو پیٹھ پر اٹھائے پھرنا

پڑتا۔صرف ماسونو اور میسا کو ایسی تھیں جو کھیل کے وقت میں بالکل آزاد ہوتی تھیں کیوں کہ ان کے چھوٹے بہن بھائی نہ تھے۔

کوتوئے کے جواب نے بچوں کو یہ سب کچھ یاد دلا دیا، لیکن اپنا ارادہ ترک کرنے کو ان کا جی نہ چاہتا تھا۔

''ایسا کرتے ہیں، کھانا کھا کر سب لوگ چپکے سے گھر سے نکل آئیں گے،'' کوتسورو نے سب کو قائل کرنے کی کوشش کی، جیسے اس منصوبے پر عمل کرنا ناگزیر ہو۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے! اگر گھر والوں سے پوچھا تو وہ کبھی نہیں جانے دیں گے۔ انھیں کچھ نہیں بتائیں گے۔ بس چپکے سے چلے جائیں گے۔'' تاکے اچی نے، جو سب سے ذہین تھا، فیصلہ کر دیا۔اس بار کسی نے بھی مخالفت نہ کی۔منصوبے کی رازداری نے ان کا جوش وخروش اَور بڑھا دیا تھا۔

''اپنے اپنے گھر سے نکل کر گودی کے پاس جمع ہو جائیں گی،'' تاداشی نے تجویز پیش کی۔

ماسونو، جو سب کی لیڈر تھی، بڑے غور کے بعد بولی: ''گودی تو دکان کے بالکل پاس ہے۔ دکان والی بڑی بی نے دیکھ لیا تو؟ ایسا کرتے ہیں، جنگل کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں، یہ سب ٹھیک ہے! پھر کھیتوں میں سے ہو کر چلیں گے۔''

سب بچے اچانک بہت مصروف ہو گئے۔

''بھاگ کر جانا ہوگا اور بھاگ کر آنا ہوگا، سمجھ میں آیا؟'' کوتوئے نے ایک بار پھر یقین دہانی حاصل کرنی چاہی۔ جب سب بچے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو وہ سوچ میں گم آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ اسے گھر سے چپکے سے نکلنے کی کوئی ترکیب نہیں سُوجھ رہی تھی۔ کیا اسے جانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے؟ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔اگر وہ سب کے ساتھ نہ گئی تو کل سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں کھیلے گا۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ لیکن وہ چپکے سے گھر سے نکل آنے کے بعد دادی یا اماں کی ڈانٹ بھی نہیں کھانا چاہتی تھی۔

''چھوٹا منّا نہ ہوتا تو کتنا اچھا رہتا،'' اس نے سوچا۔عموماً وہ اپنے منّے بھائی تاکیشی سے پیار کرتی تھی، مگر اس وقت اسے اچانک اُس سے نفرت سی محسوس ہونے لگی اور اسے سے دور چلے جانے کو دل چاہا۔ وہ ایک دم مڑی اور کھیتوں کی طرف چل دی۔ جب

جنگل دکھائی دیا تو وہ دوڑنے لگی۔ اس کا دل یہ سوچ کر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

دو گھنٹے گزر گئے، اور کوتوئے کی دادی سب سے پہلے پریشان ہوئیں۔ ''بے چاری بھوکی ہوگی۔ پتا نہیں کہاں رہ گئی،'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔ اگر وہ اس وقت گھر میں ہوتی تو بڑی بی فوراً تاکیشی کو اُس کی پیٹھ پر لاد کر خود سبزیاں چننے کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتیں۔ مگر بچی اب تک واپس ہی نہ آئی تھی۔ اسکول جا کر دیکھنا بے سود تھا کیوں کہ اسکول کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے منّے کو اٹھایا اور کوتوئے کی پیٹھ پر باندھنے کے لیے پٹی بھی لے لی۔ وہ کوتوئے کی سب سے قریبی سہیلی سانائے کے گھر کی طرف چل دیں، کیوں کہ انکا خیال تھا کہ وہ یقیناً سانائے کے ساتھ کھیل میں لگ گئی ہوگی اور اسے وقت کا کچھ خیال نہ رہا ہوگا۔

''ہیلو، کوتو ہے کیا یہاں؟'' انھوں نے پوچھا۔

ظاہر ہے، بچی وہاں نہیں تھی۔ یہی نہیں، بلکہ خود سانائے بھی اسکول سے نہیں لوٹی تھی۔ بڑی بی نے گھر واپس آتے ہوئے کوجین مندر کے میدان پر بھی تشویش کے ساتھ نظر ڈالی، مگر جو بچے وہاں بلوط کے پیڑوں کے نیچے کھیل رہے تھے وہ یا تو کوتوئے سے چھوٹے تھے یا بڑے۔ کوتوئے یا اس کے کھیل کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔ انھوں نے پکار کر وہاں کھیلتے ہوئے بچوں سے پوچھا: ''تم نے کوتوئے کو تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔''

''آج تو نہیں دیکھا۔''

''سانائے کے گھر نہیں ہے کیا؟''

بچوں نے باری باری جواب دیا، مگر کوئی بھی جواب تسلی بخش نہ تھا۔

''ننکی کہیں کی! اگر کہیں نظر آئے تو اس سے کہنا کہ فوراً گھر پہنچے، سمجھ گئے؟''

انھوں نے منّے کو پیٹھ پر بٹھا لیا اور اس سے یوں باتیں کرنے لگیں جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہا ہو:

''کہاں چلی گئی تمھاری بہن؟ آنے دو، دیکھنا اسے کیسی ڈانٹ پلاتی ہوں!''

لیکن ان کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ انھیں یاد آیا کہ بچی نے اب تک کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ گھر پہنچ کر جب وہ کچے فرش پر بیٹھی چپلیں بنانے اور بچی کے بارے میں فکر

مند ہونے میں مشغول تھیں تو کاوا موتو بڑھئی کی بیوی ہانپتی کانپتی پہنچی۔ لگتا تھا وہ بھی بہت فکر مند ہے۔

''ہیلو، روز بخیر۔ میں ماتسو کو دیکھنے آئی تھی، مگر یہاں تو نہیں ہے۔''

اس پر کوتوئے کی دادی کے ہاتھ کام کرتے کرتے ایک لمحے کو رک گئے اور ان کے منہ سے نکلا: ''ماہچان؟ وہ بھی نہیں ہے؟ ارے، سب بچے کہاں چلے گئے؟ ابھی کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔''

''ماتسو نے تو گھر آ کے کھانا کھایا تھا۔ مگر کھانا کھاتے ہی باہر چل دی جیسے کسی کام سے نکلی ہو۔ میں سمجھی ابھی واپس آ جائے گی، مگر اب تک نہیں لوٹی۔''

کوتوئے کی دادی کو اچانک بڑی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اب ان سے چپلیں بنانے کا کام نہیں ہو رہا تھا۔ جب بڑھئی کی بیوی ماتسوئے کی تلاش میں کہیں اَور چل دی تو بڑی بی کی تشویش اَور بڑھ گئی۔ وہ کبھی باہر جاتیں، کبھی اندر واپس آتیں، کھڑی ہوتیں اور پھر بیٹھ جاتیں۔ انھیں ایک پل چین نہ تھا۔

''بچی کا کیا قصور ہے۔ کھیل میں تو بچوں کا دل لگتا ہی ہے، اور اس بیچاری کو روز منّے کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ آزاد ہو کر کھیلنے کو دل تو چاہتا ہی ہوگا۔''

ان کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ ان کی دھندلی نگاہوں میں ننھی کوتوئے کی تصویر تیر رہی تھی اور محو ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ بے چاری بچی ذرا سی بڑی ہوئی تو اسے منّے کو سنبھالنے کے کام پر لگا دیا گیا جس سے گھبرا کر وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

''مگر وہ آخر گئی کہاں؟ اور کر کیا رہی ہے؟ اس کے امّاں ابّا بھی آج اب تک نہیں آئے۔''

وہ باہر نکلیں اور سمندر پر نظریں گاڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ انھیں لگا کہ کوتوئے کے امّاں ابّا بھی، جو مچھلی کا شکار کرتے تھے، آج گھر لوٹنے میں غیر معمولی دیر لگا رہے ہیں۔

جس وقت بڑھئی کی بیوی تیسری بار یہ پوچھنے آئی کہ ''کوتوئے اب تک نہیں لوٹی؟''، تب تک کوتسورو کی بہن، سانائے کا بھائی اور فوجیکو کی ماں بھی اپنی بہن یا بیٹی کی تلاش میں یہاں آ چکے تھے۔ جلد ہی ان کو پتا چل گیا کہ پہلی کلاس کے سب بچے غائب ہیں۔ کچھ دیر بعد انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بڑے اسکول سے لوٹتے ہوئے ایک بچے نے ان سب کو باچی ماندو کی کتابوں کا پیوں کی دکان کے پاس دیکھا تھا۔ یہ سن کر ان کی تشویش

آدھی رہ گئی۔ اس اثنا میں سارے گاؤں میں افواہوں کا زور تھا اور لوگ بے پر کی اڑانے میں مشغول تھے۔

''میں نے سنا ہے قصبے میں کوئی تماشا ہو رہا ہے۔ بچے وہی دیکھنے گئے ہوں گے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ انکے پاس پیسے کہاں ہیں؟''

''شاید وہ صرف تماشے کی تصویریں دیکھنے گئے ہوں اور اِنھیں کو دیکھ دیکھ کر حیرت سے منہ پھاڑ رہے ہوں۔''

''کیسے عجیب بچے ہیں!''

پہلی کلاس کے بچوں کے گھر والے بھی آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ اب وہ کچھ کچھ مسکرا بھی لیتے تھے۔

''بچے جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ بھیڑیوں کی طرح بھوکے ہو رہے ہوں گے اور چلتے چلتے پیروں پر چھالے پڑ گئے ہوں گے۔''

''احمق کہیں کے! واپس آئیں تو پتا چلے کہ کیا حشر ہوا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ واپس آنے پر اسے ڈانٹوں یا نہ ڈانٹوں۔''

''ڈانٹا نہ جائے تو کیا شاباش دی جائے؟''

اب وہ پُر امید معلوم ہو رہے تھے کیوں کہ انھیں اطمینان تھا کہ ایسو کیچی کا بھائی نیتا کا باپ اور فوجیکو کا باپ بچوں کی تلاش میں روانہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی بے پروائی دیکھیے کہ ان میں سے کسی کو مس اوئیشی کا خیال تک نہ آیا۔

اس اثنا میں، بچوں کی تلاش میں نکلنے والے تینوں آدمی بڑے گاؤں تک جا پہنچے۔ راستے میں انھیں جو کوئی ایسا شخص ملتا جس کے بارے میں گمان ہوتا کہ اس نے بچوں کو دیکھا ہوگا، وہ اس سے پوچھتے: ''معاف کیجیے گا، آپ نے دس کے قریب چھوٹے بچوں کو تو اس راستے پر جاتے نہیں دیکھا؟ چھ سات برس کی عمر کے بچوں کو؟''

انھوں نے یہ سوال کئی بار دُہرایا لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔

اور اس تمام وقت بچے کیا کرتے رہے؟

یہ کہنا تو غیر ضروری ہے کہ سب سے پہلے جنگل کے پاس پہنچنے والی کوتوئے تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنا بستہ گھاس میں چھپا دیا اور باقی بچوں کا انتظار کرنے لگی۔ پھر کیچی

جی اور ایسو کیچی بھاگتے ہوئے پہنچے، جیسے ایک دوسرے سے دوڑ لگا رہے ہوں۔ ان کے بعد تاکے ایچی اور تاداشی آئے۔ سب سے آخر میں فوجیکو اور نیتا پہنچے۔ نیتا نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی قمیض اور پتلون کی چاروں جیبوں میں بھُنے ہوئے دانے بھر لیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ جتنے دانے اس کا ہاتھ لگے وہ سب لے آیا۔ اس نے کچھ دانے اپنے دوستوں میں تقسیم کیے۔ وہ باقی سب بچوں سے زیادہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ سب دانے چباتے ہوئے چل پڑے۔

''استانی صاحبہ حیران رہ جائیں گی۔''

''اف، کتنی خوش ہوں گی۔ ہے نا؟''

کوتوئے سب سے آگے، الگ تھلگ چلی جا رہی تھی اور مڑ مڑ کر سب کو دیکھتی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو تو بھاگ کر جانا تھا، وہ سوچ رہی تھی، اور یہ کتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ بچوں کے پاس استانی کی باتیں کرنے کے سوا کوئی موضوع نہ تھا، حالاں کہ اُس کی حالت کا صحیح اندازہ انھیں اس کے گھر پہنچ کر ہی ہوسکتا تھا۔

''استانی صاحبہ چلتے میں لنگڑاتی ہیں۔''

''ان کے پیر میں اب بھی درد ہوتا ہوگا۔''

''درد نہ ہوتا تو میں لنگڑاتی کیوں؟''

پھر ایسو کیچی چند تیز تیز قدم اٹھا کر سب سے آگے نکل آیا اور بولا: ''دیکھو یہ ہوتی ہے پنڈلی کی ہڈی، یہ موٹی والی۔ یہ ہڈی ٹوٹی ہے، سمجھ میں آیا؟''

اس نے اپنی پنڈلی کی ہڈی کو سہلایا اور کہنے لگا: ''یہاں اِس جگہ سے ٹوٹی ہے۔ ظاہر ہے اس میں بہت درد ہو رہا ہوگا۔''

خیر، کچھ آگے چل کر بچوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ اس سڑک پر اکیلے پہلی بار نکلے تھے۔ جب بھی وہ کوئی موڑ مڑتے، منظر بدل جاتا، اس لیے انھیں چلتے ہوئے ذرا بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جس جگہ سڑک نے راس کو چوڑائی میں کاٹا اور کھاڑی کے کنارے کنارے چلنے لگی، وہاں سے صنوبر کا پیڑ اَور دور دکھائی دینے لگا، اور وہ بھی انکی پشت کی طرف۔ انھیں یقین نہ تھا کہ وہ صحیح سمت میں چل رہے ہیں، لیکن کسی نے اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ کچھ آگے چل کر انھیں بڑے اسکول سے گاؤں کی طرف واپس آتے ہوئے بچے دکھائی دیے۔ بچوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

MashalBooks.com

''چھپ جاؤ، چھپ جاؤ! جلدی کرو!'' ماسونو کی آواز پر باقی گیارہ بچے بندروں کی طرح اچھل کر کنارے کی لمبی گھاس میں جا چھپے۔ گھاس زور زور سے ہلنے لگی۔

''ہلو مت! آواز مت نکالو!'' ماسونو نے اپنے ہونٹ گول کر کے اپنی بڑی بڑی تیکھی آنکھوں سے بچوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ تاکے اچی اور تاداشی تک خاموش ہو کر ساکت بیٹھ گئے۔ لمبی گھاس کا جھنڈ، جو قد میں بچوں سے دُگنا تھا، ان سب کو چھپائے ہوئے آہستہ آہستہ سرسرا رہا تھا۔ ماسونو کی حاضر دماغی کی بدولت وہ بڑے بچوں کی نظروں میں آنے سے بچ گئے تھے۔ ماسونو بچوں کو گھور کر بالکل بلونگڑوں کی طرح تابعدار بنا سکتی تھی۔

راس کی سڑک کے آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے، بڑے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے، بچوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بہت مدّھم ہو چکی تھیں۔ صنوبر والے گاؤں تک پہنچنے سے پہلے راستے میں کئی چھوٹے بڑے گاؤں اور قصبے پڑتے تھے۔ بچے ان سب میں باری باری داخل ہوتے اور نکلتے رہے، یہاں تک کہ انھیں اس تکرار سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ لیکن صنوبر والے گاؤں کا اب تک کہیں پتا نہ تھا۔ راس والے گاؤں سے دیکھنے پر صنوبر کا پیڑ کتنا قریب نظر آتا تھا۔ اب تو وہ نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا تھا۔ بچوں کے دُکھتے ہوئے پیروں نے انھیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ پانچ میل، یا بڑوں کی زبان میں دورائی، کا کیا مطلب ہوتا ہے، اور ان پر خاموشی چھانے لگی تھی۔ جو لوگ انھیں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے، سب کے سب اجنبی تھے۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ وہ چلتے چلتے کسی اجنبی سرزمین میں آ نکلے ہیں، اور رفتہ رفتہ انھیں اپنی تنہائی کا بوجھ کسی بھاری پتھر کا سا محسوس ہونے لگا۔

ان میں سے کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ بس ایک موڑ مڑنے کے بعد صنوبر کا پیڑ بالکل ان کی نظروں کے سامنے ہوگا۔ مگر اتنا اندازہ سب کو ہو گیا کہ نیتا کی یادداشت بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ اور اب سب نے اپنے سوالوں سے اسکا ناطقہ بند کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ صرف ایک ایک قدم رکھتے آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سے پہلے تاکے اچی اور میسا کو کی تنکوں کی بنی چپلیں گھِس کر ٹوٹیں۔ اس نے اپنی ایک چپل، جو اب بھی پہننے کے قابل تھی، میسا کو کو دے دی اور ننگے پیر چلنے لگا۔ کیچی جی اور تاداشی کی چپلیں بھی ٹوٹنے کے قریب تھیں۔ لیکن کسی بچے کے پاس ایک پیسا بھی نہ تھا، اس لیے نئے چپل خریدنے کا

سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جن بچوں کے چپل گھس گئے تھے وہ دوسروں سے زیادہ پریشان تھے، کیوں کہ انھیں احساس تھا کہ ان کو ننگے پیر اس طویل سڑک پر چل کر گھر واپس بھی جانا ہوگا۔

اچانک کوتوئے نے رونا شروع کر دیا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا؛ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سب سے پہلے تھک گئی اور مزید آگے چلنا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر میسا کو اور فوجیکو نے بھی سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ باقی بچے رک گئے اور تینوں روتی ہوئی بچیوں کو کھوئے کھوئے سے انداز میں تکنے لگے۔ انھیں خود بھی رونا آ رہا تھا اور وہ لڑکیوں کو دلاسا دینے کے لیے ان سے کوئی بات نہیں کہہ پا رہے تھے۔ اب واپس لوٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ یہی موقع تھا کہ کوئی بچہ کہہ اٹھتا ''چلو واپس چلتے ہیں!'' لیکن ان میں سے کوئی خود کو یہ بات کہنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ ماسانو اور کوتسورو تک گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ دراصل انھیں خود بھی رونا آ رہا تھا، مگر انھوں نے ضبط کر رکھا تھا۔ اگر سب بچے رونے لگتے تو کوئی نہ کوئی ان کی مدد کو پہنچ جاتا، لیکن یہ کسی کو خیال نہ آیا۔

موسمِ خزاں کے شروع کا آسمان بالکل صاف تھا؛ سہ پہر کی دھوپ سنسان، سفید، خشک کچی سڑک پر کھڑے گھبرائے ہوئے کم سن بچوں کی اس ٹولی کی پشت پر چمک رہی تھی۔ انھیں گھر کی یاد اس قدر ستا رہی تھی کہ وہ انجانے میں اُسی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے تھے جدھر سے آئے تھے۔ اُس طرف سے چاندی کے رنگ کی ایک بس اپنا ہارن بجاتی نمودار ہوئی۔ سب بچے، غیر ارادی طور پر، بس کو راستہ دینے کے لیے پیچھے ہٹے اور سڑک کے کنارے لگی ہوئی گھاس میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کوتوئے تک نے رونا بند کر دیا اور بس پر نظر جما دی۔ جب بس بچوں کے پاس سے سفید دُھول اڑاتی گزری تو اس کی کھڑکی میں ایک چہرے کی جھلک دکھائی دی جس کو دیکھنے کا کسی کو گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ جوں ہی کھڑکی سے جھانکنے والی کے منہ سے ''اف خدایا!'' کے لفظ نکلے، بس بچوں سے آگے نکل گئی۔ یہ مس اوئیشی تھی۔

''استانی!''

''استانی صاحبہ!''

بس رک گئی، اور مس اوئیشی کو نیچے اتار کر پھر چل دی۔ مس اوئیشی اپنی

بیساکھیوں کے سہارے کھڑی بچوں کے پاس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر اس نے بے صبری سے پکار کر کہا: ''کیا بات ہے بچو؟''

بچے دوڑ کر اس سے چمٹ جانا چاہتے تھے، مگر انھیں احساس ہوا کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کچھ اپنائیت کے وفور سے، کچھ شرمیلے پن کی وجہ سے، بچے اس کے پاس آنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑے رہے۔

''ہم آپ کے پاس آ رہے تھے،'' سب سے پہلے بولنے والا نیتا تھا۔ اس کے بعد سب بچے ایک ساتھ بولنے لگے۔

''ہم نے گھر والوں کو نہیں بتایا۔''

''پھر ہمیں صنوبر کا پیڑ نظر آنا بند ہو گیا اور کو تو ئے رونے لگی۔''

''مس اوئیشی، صنوبر کہاں ہے؟ کیا ابھی بہت دور ہے؟''

''کیا آپ کے پیر میں اب بھی درد ہو رہا ہے؟''

مس اوئیشی مسکرا رہی تھی، مگر اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جب اس نے بچوں کو اطلاع دی کہ صنوبر والا گاؤں بس اگلے موڑ کے دوسری طرف ہے تو وہ خوشی سے چلانے لگے۔

''مگر یہ تو بہت دور لگتا تھا۔''

''ہم تو واپس جانے والے تھے، کیوں؟ ہے نا؟''

بیساکھیوں پر چلتی مس اوئیشی کو بچوں نے اپنے درمیان لے لیا اور سب اس کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اس کی امّاں انھیں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ انھیں فوراً مصروف ہو جانا پڑا۔ انھوں نے جلدی جلدی چولھا جلایا اور مختلف چیزیں لینے کے لیے گھر سے باہر آتی جاتی رہیں۔ بچے وہاں کوئی گھنٹا بھر ٹھہرے۔ انھیں کھانے کو نُوڈل اور دہی پھلیاں دی گئیں، اور کچھ بچوں نے دوسری بار بھی کھانا مانگا۔ استانی انھیں دیکھ کر بہت خوشی تھی اور اس نے تجویز پیش کی کہ ایک یادگار تصویر کھینچی جائے۔ اس نے پڑوس میں رہنے والے فوٹو گرافر سے بات کی اور بچوں کو باہر صنوبر کے پیڑ کے پاس لے گئی۔

''میں چاہتی تھی کہ تم لوگ ابھی کچھ دیر اور میرے پاس ٹھہرو،'' وہ بولی، ''مگر اندھیرا ہونے والا ہے۔ تمھارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

بچے گھر واپس جانا نہیں چاہتے تھے مگر مس اوئیشی نے انھیں بہلا پھُسلا کر اس پر

آمادہ کرلیا اور ایک کشتی پر بٹھا دیا۔ چار سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ خزاں میں دن چھوٹے ہو جاتے ہیں، اس لیے سورج مغرب میں ڈوبنے لگا تھا۔ راس کے گاؤں جھٹ پٹا یوں چھا رہا تھا جیسے کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی ہو۔

''خدا حافظ!''

''خدا حافظ!''

کشتی میں سے اونچی الوداعی آوازیں استانی تک آ رہی تھیں جو بیساکھیوں کے سہارے کنارے پر کھڑی کشتی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جب بچوں کی تلاش میں نکلے ہوئے تینوں آدمی سارے قصبوں اور گاؤں کی خاک چھان چکے، تو بچے ایک غیر متوقع سمت سے گاؤں واپس پہنچ گئے۔

''ہیلو!''

''ہیلو!''

سمندر کی طرف سے اچانک بلند آوازیں سنائی دیں اور گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے۔ پہلے تو والدین نے اپنے بچوں کو خوب ڈانٹا، مگر پھر سب کے سب ہنسنے لگے اور ان کے دل میں مس اوئیشی کی قدر بڑھ گئی۔

دو دن بعد ''گھنٹی والے'' کی گاڑی پر چھوٹے چھوٹے عجیب وغریب پیکٹ آ لدے۔ یہ پیکٹ اتنے چھوٹے تھے کہ اُسے گاؤں سے باہر نکل کر ان کو سیبوں کے خالی کھوکھے میں جمانا پڑا۔ اپنے طرح طرح کے سارے کام نمٹاتا ہوا وہ آخر میں صنوبر والے گاؤں میں پہنچا۔ وہ کھوکھے کو احتیاط سے اٹھا کر چلنے لگا اور اس کی پیٹی سے بندھی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ گھنٹی کی آخری آواز کے ساتھ وہ مس اوئیشی کے مکان کے صحن میں جا کھڑا ہوا۔ گھنٹی والے کی گھنٹیاں ہمیشہ کہیں سے آنے والے تحفے کی اطلاع دیتی تھیں، اور مزید سوال جواب کی عموماً ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

''یہ لو، پانچ مٹھی چاول اور ایک مٹھی دانے۔ یہ والا پیکٹ بہت ہلکا ہے۔ شاید خشک مچھلی کا ہے۔ اور اس والے میں بھی پانچ مٹھی چاول اور ایک مٹھی دانے.....''

وہ ایک ایک کر کے کھوکھے میں سے چھوٹے چھوٹے پیکٹ نکال کر صحن کے فرش پر جماتا رہا۔ ہر پیکٹ پر بھیجنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ سب تحفے جلد صحت یاب ہونے کی دعاؤں کے ساتھ گاؤں کے احسان مند لوگوں نے بھیجے تھے۔

MashalBooks.com

MashalBooks.com

الوداع

تصویر جب تیار ہو کر آئی تو اس میں صنوبر کے پسِ منظر میں مس اوئیشی بیساکھیوں کا سہارا لیے کھڑی تھی اور بارہ بچوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ کچھ بچے کھڑے تھے اور کچھ آس پاس بیٹھ گئے تھے۔ مس اوئیشی نے ایک ایک کر کے ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی: ایسو کیچی، تاکے ایچی، ماتسوئے، میسا کو..... جب اس کی نظر نیتا پر پڑی تو وہ ایسے عجیب انداز میں کھڑا تھا کہ اسے دیکھ کر مس اوئیشی کو ہنسی آ گئی۔ وہ سانس روکے یوں تن کر کھڑا تھا جیسے اگر سانس نہ لیا تو ابھی پھٹ پڑے گا۔ اسے یوں ''اٹن شن'' کھڑے دیکھ کر کسی کی بھی ہنسی نکل جاتی۔ ان بچوں نے، ماسونو اور میسا کو کو چھوڑ کر، پہلی بار تصویر کھنچوائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سب کے سب ایسے تناؤ کے عالم میں لگ رہے تھے۔ نیتا اور کیچی جی کا حال سب سے ابتر تھا۔ نیتا کے برعکس، کیچی جی کیمرے سے شرمایا ہوا تھا۔ اس نے چہرہ ایک طرف کو پھیر رکھا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا یہ انداز اس کے عام شرمیلے پن سے اتنی مطابقت رکھتا تھا کہ مس اوئیشی کو اس پر ترس آنے لگا۔

''بے چارہ۔ کچن! کتنا سہما ہوا لگ رہا ہے! شاید ڈر رہا ہو گا کہ کیمرے میں سے کوئی چیز نکل نکل کر اس پر جھپٹ نہ پڑے۔''

ابھی وہ مسکرا مسکرا کر تصویر کو دیکھ ہی رہی تھی کہ بڑے اسکول کے پرنسپل صاحب اس سے ملنے آ گئے۔ ان کی آواز سن کر اس کی حالت ویسی ہی ہو گئی جیسے تصویر میں نیتا کی تھی۔ وہ لپک کر دروازے پر پہنچی۔ اب اس نے بیساکھیاں استعمال کرنی چھوڑ دی تھیں، مگر پھر بھی لنگڑاہٹ بہت تھی۔ پرنسپل صاحب نے اس کی چال کو ماتھے پر ہمدردانہ بل ڈالتے ہوئے دیکھا۔

''تمھیں کیسی مصیبت سے گزرنا پڑا!''

MashalBooks.com

''ہاں، مگر اب تو میں کافی ٹھیک ہوگئی ہوں۔''

''کیا درد اب بھی ہوتا ہے؟''

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دے، کہ اس کی امّاں نے اس کی طرف سے جواب دے دیا، شاید یہ سوچ کر کہ پرنسپل صاحب اُسے اسکول جانا شروع کرنے پر آمادہ کرنے آئے ہوں گے۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ہیسا کو کی طرف سے اتنے عرصے سے اتنی پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے۔ یہ اب کافی ٹھیک ہوگئی ہے، مگر ابھی سائیکل چلانے کے قابل نہیں ہوئی۔ اسی لیے اب تک گھر پر رہتی ہے، آپ تو جانتے ہیں۔''

لیکن پرنسپل صاحب کے آنے کا مقصد اس پر زور ڈالنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف اس کا حال پوچھنے اور اسے ایک خوش خبری سنانے آئے تھے۔ وہ اپنے مرحوم دوست کی بیٹی کو اس کے پہلے نام سے پکارتے تھے۔ انھوں نے کہا: ''ہیسا کو، تم پہلے ہی اپنے ایک پَیر کی قربانی دے چکی ہو۔ اب میرا خیال ہے تمھیں ذیلی اسکول کی نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔ میں نے تمھاری تعیناتی بڑے اسکول میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر ابھی تم ٹھیک سے چل نہیں پاتی ہو، اس لیے کچھ دنوں تک وہاں بھی نہیں پڑھا سکو گی۔''

مس اوئیشی کی امّاں کی آنکھوں میں خوشی کے مارے ایک دم آنسو بھر آئے۔ بولیں: ''اوہ، میرے خدا!'' مگر اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔ یہ خوش خبری اتنی بڑی تھی کہ انھیں شکریہ ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ اپنی بیٹی کو بڑی دیر خاموش پاکر، اور کچھ اپنی بوکھلاہٹ کو چھپانے کی غرض سے، انھوں نے اسے مخاطب کیا:

''ہیسا کو، تمھاری زبان کو کیا ہوا؟ پرنسپل صاحب کا شکریہ کیوں نہیں ادا کرتیں؟''

لیکن مس اوئیشی کو پرنسپل صاحب کے اس ہمدردانہ فیصلے سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اگر چھ مہینے پہلے یہ خوش خبری اسے سنائی جاتی تو وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑتی، مگر اب کسی وجہ سے وہ ایسے سادہ ردِعمل کا اظہار نہیں کر پا رہی تھی۔ چناں چہ اس کے منہ سے جو الفاظ نکلے، انھیں شکریہ کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

''آ.....آ..... کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے؟ کیا آپ نے میری جگہ کسی کو تعینات کر دیا؟''

MashalBooks.com

''ہاں، یہ فیصلہ کل کی اسٹاف میٹنگ میں ہوا ہے۔ کیا تمھیں اس پر کچھ اعتراض ہے؟''

''نہیں، مجھے اعتراض کرنے کا تو حق نہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔''

اگر اس کی امّاں اس وقت یہاں ہوتیں تو یقیناً اسے ڈانٹ دیتیں، مگر وہ پرنسپل صاحب کی خاطر تواضع کے لیے کیک وغیرہ خریدنے جا چکی تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' پرنسپل صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''وہ، بات یہ ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں سے گاؤں واپس آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔''

''ارے، خدا کے لیے! تم وہاں جانا کیسے شروع کر سکتی ہو؟ تمھاری امّاں نے بتایا ہے کہ ابھی کچھ عرصے تک تم سائیکل چلانے کے قابل نہیں ہوگی۔ اسی لیے تو میں نے یہ بندوبست کیا ہے۔''

اب وہ کوئی اَور بہانہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن اس کی راس والے گاؤں واپس جانے کی خواہش اور شدید ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھی۔ وہ یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی: ''میری جگہ کون آیا ہے؟''

''مسز گروتو۔''

''اوہ!''

اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا: ''کتنے افسوس کی بات ہے!'' اب وہ اپنے لیے نہیں، مسز گروتو کے لیے فکرمند تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ ہر روز اسکول کیسے پہنچا کریں گی۔ مسز گروتو کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور ان کا ایک شیر خوار بچہ تھا کیونکہ ان کی شادی دیر سے ہوئی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں راس والے گاؤں سے کچھ نزدیک رہتی تھیں، مگر روز چار میل جانا اور آنا اس کے کے لیے کیسے ممکن ہوگا، اور پھر جاڑے بھی آنے والے ہیں! مس اوئیشی نے نظریں اٹھائیں اور، کچھ مسز گروتو کی ہم دردی میں اور کچھ اپنی ہچکچاہٹ کے خیال سے، کہنے لگی:

''سر اگر یہ کیا جائے تو کیسا رہے گا؟ جب میرا پیر ٹھیک ہو جائے تو میں مسز گروتو کی جگہ پھر جانے لگوں؟ یعنی ان کی تعیناتی عارضی طور پر کی جائے؟''

MashalBooks.com

اس کے خیال میں یہ بڑا عمدہ بندوبست تھا، مگر پرنسپل صاحب کا جواب سن کر وہ حیران رہ گئی۔

''تم کتنی فرض شناس ہو ہیسا کو! مگر تمھیں اتنا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے، کیوں کہ مسز گروتو خود راس والے گاؤں جانا چاہتی ہیں۔''

''مگر کیوں؟''

''ہم انھیں اگلے سال ریٹائرمنٹ لینے کو کہنے والے تھے، لیکن اگر وہ ذیلی اسکول میں چلی جائیں تو تین سال اَور پڑھا سکیں گی۔ جب میں نے انھیں یہ بات بتائی تو وہ خوشی سے تیار ہوگئیں۔''

''ریٹائرمنٹ؟ ابھی سے؟''

کیا سینتیس اڑتیس سال کی عورت ریٹائرمنٹ کے لائق ہو جاتی ہے؟ کیا شیر خوار بچے کی ماں کو بوڑھا کہا جا سکتا ہے؟ مس اوئیشی حیرت میں پڑ کر چپ رہ گئی۔ اس کی امّاں، جو اس اثنا میں باہر سے لوٹ آئی تھیں اور اب پھلوں اور دوسری چیزوں کو کشتی میں سجا کر پیش کر رہی تھیں، اپنی بیٹی کی ضد پر سخت شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔

''یہ کیا طریقہ ہے ہیسا کو؟ تم نے ان کی مہربانی پر ان کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ میں نے تمھیں بات کرنے کا موقع دیا مگر تم تب سے عجیب عجیب باتیں کر رہی ہو۔''

انھوں نے پرنسپل صاحب کو جھک کر آداب کیا اور بولیں: ''میرا خیال ہے کہ میں نے ہیسا کو کی تربیت ٹھیک سے نہیں کی۔ اکلوتی ہے نا، شاید اسی لیے میں انجانے میں اس کا زیادہ لاڈ کرتی رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اتنی بے تمیزی سے بات کرتی ہے۔ مگر آج کل اس کے سر پر ہر وقت اپنا اسکول ہی سوار رہتا ہے۔ وہاں واپس جانے کے لیے بے چین ہے۔ اب آپ نے اس کا تبادلہ بڑے اسکول میں کر دیا ہے تو مجھے یقین ہے دس ایک دن میں بس کے ذریعے آنے جانے کے قابل ہو جائے گی۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، کس قدر ضدّی ہے، مگر میری خاطر اسے معاف کر دیجیے۔''

انھوں نے وہ سب باتیں کہہ ڈالیں جو اپنی بیٹی سے کہلوانا چاہتی تھیں، اور کئی بار پرنسپل صاحب کی تعظیم میں جھکیں۔ انھوں نے آنکھ سے اپنی بیٹی کو اشارہ بھی کیا، مگر مس اوئیشی نے اسے نظرانداز کر دیا اور مسز گروتو کے بارے میں باتیں کرنا جاری رکھا۔

''کیا مسز گروتو نے وہاں پڑھانا شروع کر دیا؟''

MashalBooks.com

شاید پرنسپل صاحب بھی اس ضدی، بگڑی ہوئی لڑکی کی باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''نہیں، ابھی تو نہیں۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک اَور اسٹاف میٹنگ بُلا کر فیصلہ تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ ویسے اس سے مسز گروتو کو خاصی مایوسی ہوگی۔''

اِدھر مس اوئیشی کی امّاں پر یہ باتیں سن سن کر بے چینی اور گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ پرنسپل صاحب نے انھیں مخاطب کیا: ''ہیسا کو کو دیکھ کر مجھے اس کے ابّا یاد آ جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی ضدّی تھے۔ آپ کو یاد ہے، انھوں نے اُس وقت ہڑتال کرا دی تھی جب وہ پرائمری اسکول میں تھے، جب کسی نے ہڑتال کا نام بھی نہیں سنا تھا؟''

وہ زور زور سے ہنسنے لگے۔ مس اوئیشی یہ قصہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کے ابّا جب چوتھی کلاس میں پڑھتے تھے، تو انھیں اپنے ایک استاد پر غلط فہمی کی وجہ سے غصہ آ گیا تھا، اور انھوں نے اپنے ہم جماعت بچوں کو اُکسا کر ایک دن کی ہڑتال کرا دی تھی۔ ان کے ساتھی بچے، جن میں یہ پرنسپل صاحب خود بھی شامل تھے، ان کی ہم دردی میں جلوس کی شکل میں گاؤں کے دفتر تک گئے تھے اور نئے استاد کی تعیناتی کا مطالبہ کیا تھا۔ پچھلے موسمِ بہار میں، جب مس اوئیشی اپنی امّاں کے ساتھ نوکری کی درخواست کرنے پرنسپل صاحب کے پاس گئی تھی، تو ان دونوں کو یہ قصہ پہلی بار معلوم ہوا تھا اور تینوں اس پر دل کھول کر ہنسے تھے۔ پرنسپل صاحب اس قصے کی خوش گوار یاد آنے پر پھر لطف اندوز ہو کر قہقہے لگا رہے تھے۔ مگر عجیب بات تھی کہ مس اوئیشی کو اسی قصے نے آج سنجیدہ کر دیا تھا۔

پرنسپل صاحب کے جانے کے بعد بھی مس اوئیشی گہرے خیالوں میں ڈوبی رہی۔ اس کی امّاں نے اسے تسلّی دینے کے خیال سے کہا: ''چلو، یہ اچھا بندوبست ہو گیا۔ کیوں، ٹھیک ہے نا؟'' مگر مس اوئیشی خاموش رہی۔

جب دونوں ماں بیٹی رات کے کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے تو مس اوئیشی سے معمول کے مطابق کھانا نہ کھایا گیا۔ وہ رات دیر گئے تک اسی اُدھیڑ بُن میں رہی اور آخر کار اپنی امّاں سے کہنے لگی: ''ہاں، شاید ٹھیک ہی ہوا..... میرے لیے بھی، اور مسز گروتو کے لیے بھی۔'' یہ اُس جملے کا جواب تھا جو اس کی امّاں نے تقریباً چار گھنٹے پہلے اس سے کہا تھا۔

امّاں نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا۔ وہ کافی پُرسکون لگ رہی تھیں۔ بولیں: ''ہاں ہیسا کو، میرا تو خیال ہے بڑا اچھا انتظام ہو گیا۔''

مس اوئیشی ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد پُرعزم آواز میں بولی:
''مگر میرا قطعی یہ خیال نہیں ہے۔۔کوئی اچھا انتظام نہیں ہوا ہے۔کم سے کم مسز گروتو کے لیے۔کیسی عجیب بات ہے کہ اُن کی عمر کی عورت کو بوڑھا کہا جائے!''

اس کی امّاں نے بحث میں الجھنے سے گریز کیا، مگر بڑے نرم لہجے میں، جیسے اپنی بیٹی کو دلاسا دے رہی ہوں، کہنے لگیں: ''چلو، اب سو جائیں۔بہت دیر ہو گئی۔''

اگلی صبح مس اوئیشی نے کشتی پر راس والے گاؤں جانے کا ارادہ کیا۔کشتی چلانے والا دراصل صنوبر کے گاؤں کا ''گھنٹی والا'' تھا جس کا کام، کوتسورو کے باپ کی طرح، لوگوں کی ضرورت کی چیزیں لانا لے جانا تھا، مگر وہ اس کام کے لیے کشتی استعمال کرتا تھا۔ یہ اکتوبر کے آخری دنوں کی صبح تھی اور ہوا رُکی ہوئی تھی۔آسمان اور سمندر دونوں کا رنگ بالکل نیلا تھا اور سمندر کی فضا اتنی سرد تھی کہ مس اوئیشی نے بے ارادہ اپنے کیمونو کی آستینیں اپنے گرد لپیٹ لیں۔

''کتنی خنکی ہے! کچھ ہی دنوں میں استر والا کیمونو پہنے بغیر گزارا نہیں ہوگا، کیوں انکل؟''

''نہیں، سورج چڑھنے کے بعد اتنی خنکی نہیں رہتی۔یہ سال کا سب سے اچھا موسم ہے۔نہ زیادہ سرد نہ زیادہ گرم۔''

آج مس اوئیشی نے سُرخ کا کیمونو پہن رکھا تھا جس پر سفید دھاریوں سے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے، اور اس پر اوپر سے پہنا جانے والا اسکرٹ پہن لیا تھا جو گہرے عنّابی رنگ کا تھا۔کشتی کے فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور وہ اس پر اپنی ٹانگیں مخالف سمتوں میں پھیلائے بیٹھی تھی۔خوش قسمتی سے اس کے اسکرٹ نے اس کے اس نامناسب انداز سے بیٹھنے کی پردہ داری کر دی تھی۔کشتی گہرے نیلے سمندر میں آگے بڑھتی جا رہی تھی، مس اوئیشی کی نظریں راس پر جمی ہوئی تھیں اور چپوؤں کی ہموار آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔وہ بڑی خوش گوار حالت میں کشتی پر بیٹھ کر اسی کھاڑی کو پار کر رہی تھی جہاں سے اسے دو مہینے پہلے سخت خراب حالت میں لایا گیا تھا۔

''تمھیں واقعی بڑی مشکل اٹھانی پڑی ہے۔ہے نا؟''

''ہاں۔''

''مگر نوجوانوں کی ہڈیوں میں بڑی لچک ہوتی ہے، ٹوٹنے کے بعد فوراً ہی جُڑ

جاتی ہیں۔''

''یہ کوئی عام ہڈّی نہیں تھی۔ یہ والی ہڈّی اتنی آسانی سے نہیں جڑتی۔''

''اچھا؟ پھر تو اَور بھی تکلیف ہوئی ہوگی۔''

''مگر یہ بچوں کی شرارت نہیں تھی۔ بس ایک حادثہ تھا، کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''بہر حال..... بچوں نے تمھارے ساتھ شرارت تو کی..... اور پھر بھی تم..... ان سے ملنے جا رہی ہو..... انھیں خدا حافظ کہنے..... تم دل کی بڑی اچھی ہو..... ہی ہَو!''

کشتی والے نے یہ جملے توڑ توڑ کر، گویا کشتی کے چپوؤں کی حرکت پر تال دیتے ہوئے کہے۔ اور اس کے بعد ''ہی ہو!'' کا نعرہ لگا کر اَور تیزی سے چپّو چلانے لگا۔ مس اوئیشی بھی تھوڑا تھوڑا ہنستے ہوئے اسی انداز میں بولنے لگی۔

''آپ کچھ بھی کہیں..... مگر وہ بچے..... ذرا سوچیے..... ابھی صرف پہلی کلاس میں ہیں..... اور اتنی دُور..... مجھ سے ملنے آئے..... اور اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر..... میں کیسے جا سکتی ہوں..... انھیں خدا حافظ کہے بغیر..... ہی ہو!''

اس کے خوش گوار موڈ نے کشتی والے کو بھی خوش کر دیا۔ وہ بولا: ''ہاں، جیسے کہتے ہیں..... اخلاق اور انکسار..... کبھی نہ چھوڑو..... ہی ہو!''

بہت دنوں بعد مس اوئیشی دل کھول کر اتنا ہنسی کے اس کے پہلو لرزنے لگے۔ سمندر میں ہنسی سے کسی کے چونکنے کا بھی سوال نہ تھا۔ اس کی ہنسی بھی چپوؤں کی موسیقی کی مطابقت میں تھی۔ کشتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ دوسری طرف کا گاؤں دکھائی دینے لگا۔ اگرچہ راس کے کونے کی فضا اب تک چولھوں سے اٹھتے دھویں سے ڈھکی ہوئی تھی، لگتا تھا کہ دن کا معمول کب کا شروع ہو چکا ہے، اور بے شمار چھوٹی بڑی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''سب بچے اس وقت کیا کر رہے ہوں گے؟'' وہ سوچنے لگی۔ ''ماسو نو تیز تیز قدموں سے اپنے گھر سے اُس وقت نکلتی تھی جب میری سائیکل دکان کے سامنے پہنچتی تھی، اِیسو کیچی گودی کے قریب کھڑا میرا انتظار کیا کرتا تھا، نِیتا ہفتے میں کم سے کم ایک بار دیر سے اسکول پہنچتا تھا، کیچی جی نے پہلی ٹرم کے دوران دو بار اپنے کپڑے گیلے کر لیے تھے.....'' مس اوئیشی ایک ایک کر کے ہر بچے کے بارے میں سوچتی ہوئی ان سب کی ہمت پر متعجب ہو رہی تھی جو انھوں نے اپنی کم سنی کے باوجود صنوبر والے گاؤں تک پیدل آنے میں دکھائی تھی۔ اُس روز کے چھوٹے چھوٹے، گرد آلود چہروں کا سوچ کر وہ محبت اور

شفقت سے کپکپا اٹھی۔

''پچھلی بار انھوں نے مجھے حیران کر دیا تھا، سو آج میں جواب میں انھیں حیرت میں ڈال دوں گی۔ دیکھتے ہیں سب سے پہلے کون مجھے دیکھتا ہے۔'' استانی خوشی اور انتظار کے اِنھیں خیالوں میں محو تھی اور کشتی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اب راس، اپنے سبز جنگل اور چھوٹے چھوٹے مکانوں کی سیاہ چھتوں کے ساتھ، اُس کی طرف کھسکتی آ رہی تھی۔ ساحل پر دو چھوٹی بچیاں کھڑی اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ وہ پہلی کلاس کی بچیاں معلوم نہیں ہوتی تھیں، اور ان کی آنکھیں آتی ہوئی کشتی پر عجیب طرح سے جمی ہوئی تھیں۔ راس کے گاؤں میں، جہاں زندگی خاصی یکسانی سے چلتی رہتی تھی، گاؤں والے خشکی یا سمندر سے اپنی طرف آنے والے کسی بھی فرد کو موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتے تھے، اور ایسے موقعوں پر لوگوں کی ایک چھوٹی سی بھیڑ ذرا سی دیر میں اکٹھی ہو جاتی تھی۔ اس بار بھی ساحل پر کھڑے کشتی کو دیکھنے والے بچوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے پانچ، پھر سات تک پہنچ گئی۔ آخر کشتی اتنے قریب آ گئی کہ ان کی آواز بھی سنائی دینے لگیں اور چہروں کے نقوش واضح ہونے لگے۔ لیکن ان بچوں میں سے کوئی بھی اندازہ نہ لگا سکا کہ کیمونو پہنے ہوئے یہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ وہ سنجیدہ چہروں کے ساتھ اس کی طرف متواتر دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کو دیکھ کر مسکرائی تب بھی وہ اسے نہ پہچان سکے۔ وہ بے تاب ہو گئی اور غیر ارادی طور پر ہاتھ بلند کر کے لہرانے لگی۔ بچوں کا شور اچانک بلند ہوا اور ان کے چلّانے کی آواز آنے لگی۔

''ارے، استانی صاحبہ آ گئیں!''

''استانی!''

''استانی صاحبہ آئی ہیں!''

کشتی کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے، بچوں کے ساتھ ساتھ کچھ بڑے بھی مس اوئیشی کے استقبال کے لیے آ کھڑے ہوئے۔ جب کشتی والے نے کنارے پر رسّی پھینکی تو اسے اتنا زور لگا کر کھینچا گیا کہ کشتی خشکی پر چڑھ گئی۔ کچھ دیر ساحل پر کھڑے ہنسنے اور باتیں کرنے کے بعد مس اوئیشی اور بچے اسکول کی طرف چلے۔ راستے میں ملنے والے ہر شخص نے رک کر اس سے بات کی اور خیریت پوچھی۔ ''آپ کا پیر اب کیسا ہے۔ مجھے آپ کی بڑی فکر تھی۔''

مس اوئیشی نے ان میں سے ہر شخص کی بات کا جواب دیا۔ ''میں اب کافی ٹھیک

ہوں، شکریہ۔ آپ کی بڑی مہربانی کہ مجھے چاول کا تحفہ بھجوایا۔''

''ارے مہربانی کیسی، یہ تو بڑا معمولی سا تحفہ تھا۔''

کچھ دور جا کر اس کی ملاقات ایک آدمی سے ہوئی جو کندھے پر کدال لیے چلا آ رہا تھا۔ اس نے استانی کے احترام میں اپنے سر پر بندھا رومال کھولنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی دوسروں کی طرح اپنی ہم دردی کا اظہار کیا۔ مس اوئیشی نے کہا: ''موٹے دانوں کے اس تحفے کا شکریہ جو آپ نے مجھے بھجوایا تھا۔''

وہ آدمی تھوڑا سا مسکرایا۔ ''ہم نے تو تِل کے بیج بھجوائے تھے۔''

استانی کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اس نے ہر ایک کے تحفے کی تفصیل کا ذکر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ چوں کہ اس نے یہاں صرف ایک ٹرم پڑھایا تھا، اس کے لیے سب گاؤں والوں کو پہچاننا دشوار تھا، سوائے اُن کے جن کے بچے پہلی کلاس میں پڑھتے تھے۔ اگلا آدمی جو اسے ملا، ماہی گیر معلوم ہوتا تھا۔ یہ غالباً وہی تھا جس نے تحفے میں اسے مچھلی بھیجی تھی۔ وہ آداب کہنے کو جھکی اور احتیاط سے بولی:

''صحت یابی کے اس تحفے کے لیے شکریہ جو آپ نے مجھے بھجوایا تھا۔''

وہ آدمی یہ سن کر اچانک گھبرایا ہوا لگنے لگا۔ ''آ.....آ..... میں آپ کو تحفہ بھجوانا تو ضرور چاہتا تھا، مگر کسی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی اور میرا تحفہ رہ گیا۔''

استانی بھی گھبرا گئی اور اور اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ''اوہ، میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔''

اگر یہ حادثے سے پہلے کی بات ہوتی تو سب یہی کہتے کہ استانی نے یہ جملہ تحفہ طلب کرنے کے لیے کہا ہو گا۔ جب وہ اس شخص کے پاس گزر کر آگے چلی گئی تو بچے زور زور سے ہنس پڑے۔ ایک لڑکا بولا: ''مس اوئیشی، سائچی کے ابّا نے آج تک کسی کو کوئی تحفہ نہیں دیا۔ وہ صرف تحفے وصول کرتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے، اگر انھیں جنگل میں کام کرتے ہوئے زور کا پیشاب آ رہا ہو تو وہ اتنی دور چل کر اپنے کھیت میں جاتے ہیں پیشاب کرنے کے لیے۔''

سب بچے ہنس پڑے۔ مس اوئیشی نے یہ قصہ اس سے پہلے بھی ایک بار سنا تھا۔ اس شخص کا بیٹا چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا اور اپنی کلاس کا واحد بچہ تھا جو موسیقی کی نوٹ بک لے کر نہیں آتا تھا۔ ایک روز استانی نے اس کی وجہ پوچھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر بار

بھول جاتا ہے۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا، جیسے ابھی رونا شروع کرنے والا ہو۔ اس کے بجائے اس کے برابر والے بچے نے جواب دیا: ''اس کے ابّا کہتے ہیں موسیقی سے پیسے نہیں کمائے جا سکتے، اس لیے میں نوٹ بک پر پیسے کیوں خرچ کروں۔''

موسیقی کے اگلے پیریڈ میں مس اوئیشی نے سائچی کو نوٹ بک لا کر دی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کتنی خوشی سے وہ نوٹ بک لی تھی۔ اس کے بستے میں ساری کتابیں پرانی خریدی گئی تھیں، حالاں کہ اس کا باپ گاؤں کا دوسرا سب سے مال دار آدمی تھا۔

مس اوئیشی کو یہ دیکھ کر سکون ہوا کہ سائچی اس وقت ساتھ نہیں ہے۔ ٹھیک اس وقت نِنیتا نے اس سے پوچھا: ''آپ کے پیر میں اب بھی درد ہوتا ہے؟'' وہ پہلا بچہ جس نے اس سے کوئی سوال کیا تھا۔ حالاں کہ استانی اب بیساکھیاں استعمال نہیں کرتی تھی، مگر اس کی چال میں لنگڑاہٹ اب تک باقی تھی جسے دیکھ کر نِنیتا کو بڑا افسوس ہو رہا تھا۔

''کیا آپ ابھی تک سائیکل نہیں چلا سکتیں؟'' اگلا سوال کوتسورونے کیا۔

''نہیں، مگر میرا خیال ہے چھ مہینے میں چلانے لگوں گی۔''

''تو کیا اب آپ کشتی میں اسکول آیا کریں گی؟'' ایسوکیچی کے سوال کا جواب مس اوئیشی نے محض نفی میں سر ہلا کر دیا۔ کوتوئے نے اس حیران ہو کر پوچھا: ''اچھا؟ تو پھر کیا آپ پیدل آیا کریں گی؟ کیا آپ اتنی دور پیدل چل سکتی ہیں؟''

کوتوئے کے لیے وہ پانچ میل لمبا راستا ناقابلِ فراموش تھا۔ اس پر چلتے ہوئے اسی نے سب سے پہلے بھوک اور پریشانی سے رونا شروع کیا تھا۔ اُس روز اس کے گھاس میں بستا چھپا کر سب کے ساتھ چل پڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ تنہا رہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ جب واپسی میں سب بچوں کو کشتی میں بٹھا کر بھیجا گیا تو سب کے برعکس وہ بڑی اداس تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور اسے ڈانٹ پڑنے کے خیال سے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی دادی جو اسے لینے کے لیے گھر سے باہر نکل آئی تھی، باقی بچوں کے گھر والوں سے کہیں زیادہ بے چین تھیں۔ وہ کشتی تک جانے کے لیے تختہ ڈالنے جانے سے پہلے ہی پانی میں چلتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی تھیں اور ہاتھ بڑھا کر کوتوئے کو سب بچوں سے پہلے کشتی میں سے نکال لائی تھیں۔ جب تمام بچے تختے پر چل کر بڑے فخر کے ساتھ سورماؤں کی طرح اپنے اپنے والدین کے پاس آ رہے تھے، صرف کوتوئے اور اس کی دادی امّاں رو رہی تھیں۔ وہ دونوں پہلے بستہ اٹھانے جنگل کے قریب گئیں اور پھر گھر روانہ ہوئیں۔ اس وقت تک

دونوں معمول کے مطابق آپس میں باتیں کرنے لگی تھیں۔

''اب مجھے بتائے بغیر کہیں مت جانا۔ جانے سے پہلے مجھے بتا ضرور دینا۔''

''لیکن میں جب بھی آپ سے کہیں جانے کو کہتی ہوں، آپ منع کر دیتی ہیں۔''

''ہاں، یہ تو سچ ہے۔ یہ تو تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔'' اس کی دادی امّاں کمزور، کپکپاتی آواز میں ہنسنے لگیں۔ ''مگر بہرحال، کہیں جانے سے پہلے کم از کم کھانا ضرور کھا لیا کرو۔ خالی پیٹ کہیں جانا تمھارے لیے اچھا نہیں ہے۔''

دادی امّاں کی اس بات پر کوتوئے کو وہ نُوڈل یاد آئے جو اس نے مس اوئیشی کے گھر کھائے تھے۔ وہ اتنے لذیذ تھے کہ ان کا خیال آتے ہی کوتوئے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اصل بات شاید یہ تھی کہ اُس وقت اسے بہت بھوک لگ رہی تھی اور اسے وہ نوڈل معمول سے کئی گنا زیادہ مزے دار لگے تھے اور ان کا ذائقہ اس کی یادداشت پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے جب کبھی کوتوئے کو نوڈل کا خیال آتا تو ساتھ ہی مس اوئیشی بھی یاد آ جاتیں، یا جب مس اوئیشی کا خیال آتا تو ان کے ساتھ نوڈل بھی یاد آتے۔ اب جب کہ مس اوئیشی غیر متوقع طور پر واپس آ گئی تھیں، کوتوئے نے ان سے پوچھا تھا: ''کیا آپ اتنی دور پیدل چل سکتی ہیں؟'' اس سوال کے ساتھ ہی اسے وہ لمبا راستہ اور اس کے ساتھ ہی وہ نوڈل بھی یاد آ گئے تھے۔ مگر صرف کوتوئے ہی نہیں، سب بچے یہی سمجھ رہے تھے کہ مس اوئیشی آج سے پھر اسکول آنا شروع کر رہی ہیں۔ کسی کو بھی اس بارے میں ذرا شبہ نہ تھا۔ اس پر مس اوئیشی کو احساس ہوا کہ اسے پہنچتے ہی ان لوگوں کو اصل بات بتا دینی چاہیے تھی۔

اسے یہ سوچ کر افسوس ہونے لگا کہ اگر وہ کشتی سے اترتے ہی نعرہ لگا دیتی کہ ''میں تم لوگوں کو خدا حافظ کہنے آئی ہوں،'' تو سب لوگ اس کی بات فوراً سمجھ جاتے۔ بہرحال، اس نے کوتوئے کے سوال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:

''بہت لمبا راستہ ہے، ہے نا؟ اگر میں اس طرح لنگڑاتے ہوئے پیدل چل کر آئی تو یہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ اس لیے..... اس لیئے ..... یہ ممکن نہیں ہے۔''

اب بھی بچوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے۔ ماہی گیر کے

بیٹے تاداشی نے ایک تجویز پیش کی جو اس کی طبیعت کے عین مطابق تھی۔

''مس اوئیشی، آپ ہر روز کشتی سے آجایا کریں۔ میں آپ کو اپنی کشتی میں لے آیا کروں گا۔ صنوبر والے گاؤں تک تو کوئی خاص فاصلہ نہیں ہے۔''

اس نے تازہ تازہ چپو چلانا سیکھا تھا اور اس پر بہت خوش تھا۔ مس اوئیشی اس کی بات سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ''واقعی؟ اور مجھے واپس چھوڑنے کون جایا کرے گا؟''

''واپس بھی ہمیں چھوڑیں گے، اَور کون! ہے نا؟'' تاداشی نے ایسو کیچی سے پوچھا۔ شاید اس کی خود اعتمادی اب کچھ کم ہوگئی تھی اور وہ اپنے دوست سے تائید چاہتا تھا۔ ایسو کیچی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''تمھارا بہت بہت شکریہ۔ کاش میں یہ بات پہلے معلوم ہوگئی ہوتی۔ مگر اب تو مشکل یہ ہے کہ میں نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔''

بچے کچھ نہ بولے۔

''اس لیے میں آج خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔''

بچے اس پر بھی چپ رہے۔

''ایک اَور استانی بہت جلد آنے والی ہیں۔ تم ان سے اچھے شاگردوں کی طرح پیش آنا۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے، مگر میں اپنے پیر کی وجہ سے مجبور ہوں۔ پیر ٹھیک ہو جائے تو میں پھر آؤں گی۔''

وہ سب سر جھکا کر مس اوئیشی کے پیروں کی طرف دیکھنے لگے۔ سانائے کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے لیکن اس نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھلی رکھیں تاکہ آنسو ڈھلک نہ پڑیں۔ جوں ہی مس اوئیشی کی نظر سانائے کے آنسوؤں پر پڑی (سانائے اپنے جذبات کا لفظوں میں شاذ و نادر ہی اظہار کرتی تھی) تو اُس کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر ماسونو ایک دم یوں رو پڑی جیسے اس کا ہاتھ بھڑوں کے چھتّے پر لگ گیا ہو۔ اس کے بعد کوتوئے، میسا کو اور مضبوط ارادے والی کوتسورو نے بھی سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ پھر تو رونے دھونے اور سسکیاں لینے کا کورَس ہی شروع ہوگیا۔

پھاٹک کے دونوں طرف کے پتھریلے ستونوں کے پاس، جہاں ذیلی اسکول کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا، ایک اونچا پیڑ بید کا اور ایک صنوبر کا تھا۔ بید کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوکر، جب مس اوئیشی کو پینتیس کے قریب بچوں نے گھیرے میں لے لیا تو اس نے

بھی اپنے آنسو روکنے کی کوشش ترک کر دی۔ چوں کہ کورَس کی قیادت زور زور سے روتی ہوئی ماسونو کر رہی تھی، اس لیے سب بچے اس میں شامل تھے، البتّہ کیچی جی اور نیتا ضبط کرنے کو کوشش کر رہے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے شاگرد پاس کھڑے محظوظ ہو رہے تھے۔

ماسٹر صاحب نے اسٹاف روم کی کھڑکی میں سے یہ منظر دیکھا، پرانے جوتوں کے ٹکڑوں سے بنی چپلیں پہنیں اور دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ پورا قصہ سن کر انھوں نے کہا: ''تم سب کو کیا ہو گیا ہے؟ بے چاری استانی صاحبہ تو اتنی اچھی ہیں کہ تمھیں خدا حافظ کہنے اتنی دور آئیں۔ تمھیں ان کا مسکرا کر استقبال کرنا چاہیے۔ اور تم ہو کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے ہو! چلو، اب بھاگو یہاں سے۔ استانی صاحبہ، آپ مہربانی سے اندر چلی آیئے۔''

یہ سن کر بھی سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے اور رونا دھونا جاری رہا۔

''اچھا بھئی، میں ہارا۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عورتوں اور بچوں سے نمٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ جتنا تم لوگوں کا جی چاہے، روؤ۔ جتنا جی چاہے۔''

جب ماسٹر صاحب اپنی چپلیں پھٹکارتے واپس ہوئے تو بچے اچانک ہنسنے لگے۔ انھیں یہ بات بڑی عجیب لگی کہ رونے کو کہا جا رہا ہے۔

لکڑی کی تختی پر دستک دے کر اسکول کا وقت شروع ہونے کا اعلان کیا گیا، اور پڑھائی کا آغاز اب ہونے ہی والا تھا۔ مس اوئیشی کا خیال صبح کی اسمبلی میں الوداعی تقریر کر کے واپس لوٹ جانے کا تھا، مگر وہ بے اختیار پہلی اور دوسری کلاس کے کلاس روم میں داخل ہو گئی۔ بچے بے حد خوش تھے کیوں کہ آج، اتنے دن بعد، ان کی استانی ان کے ساتھ تھیں۔

''چلو یہ پہلا پیریڈ ساتھ گزار لیتے ہیں اور پھر خدا حافظ کہیں گے۔ یوں تو یہ حساب کا پیریڈ ہے، لیکن اگر تم چاہو تو ہم اس پیریڈ میں کچھ اَور بھی کر سکتے ہیں۔ بتاؤ، کیا کریں؟''

بہت سے بچوں کے ہاتھ ہوا میں بلند ہوئے اور ''مجھ سے پوچھیے''، ''مجھ سے پوچھیے'' کی آواز سنائی دیں۔ اس سے پہلے کہ مس اوئیشی کسی سے کچھ پوچھے، ماسونو نے چلّا کر کہا: ''گیت گاتے ہیں!'' اس پر خوشی کے نعرے بلند ہوئے اور تالیاں بجائی گئیں۔ یہ خیال سب کو پسند آیا تھا۔

ماسونو نے پھر تجویز پیش کی: ''ساحل پر چل کر گیت گاتے ہیں!''

یہ سن کر بچوں نے ایک بار پھر خوشی کی چیخیں ماریں۔

''مس اوئیشی، چلیے نا، ساحل پر چل کر گیت گائیں۔'' ماسونو مستقل قیادت پر مصر تھی۔

''جاؤ، ماسٹر صاحب کو بتا دو اور مجھے ساحل پر چھوڑ آؤ۔ وہاں کشتی میرا انتظار کر رہی ہے۔''

بچوں نے تالیاں اور ڈیسکیں بجائیں۔ انھوں نے ماسٹر صاحب سے بات کی تو ماسٹر صاحب نے کہا کہ اسکول کے تمام بچے استانی صاحبہ کو چھوڑنے چلیں گے۔ وہ لنگڑاتی ہوئی مس اوئیشی کو اپنے درمیان گھیر کر ساحل کی طرف چلے۔ آئے آگے پہلی کلاس کے بچے چل رہے تھے۔ ماسٹر صاحب سب سے پیچھے مس اوئیشی کی سائیکل کو دھکیلتے چلے آ رہے تھے۔ گاؤں کے جو جو لوگ راستے میں ملے، وہ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

''اس بار رونا مت،'' مس اوئیشی نے باری باری بچوں کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ کرو، ماہچان، کہ روؤ گی نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور تم بھی، کوتوئے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور تم، سانائے۔''

''ٹھیک ہے۔''

یہ تینوں رونے دھونے میں سب سے پیش پیش تھیں۔ جب ان تینوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر لیا ہے، مس اوئیشی نے سوچا، تو پھر سب کچھ ٹھیک رہے گا۔

جس وقت لڑکیاں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر رہی تھیں، پورا ہجوم ساحل پر پہنچ گیا۔ نیتا نے ماسونو کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں پوچھا: ''کون سا گیت گائیں گے؟''

''اولد لینگ سائن اور کون سا،'' ماسٹر صاحب نے کہا۔ لیکن یہ گیت پہلی کلاس والوں کو نہیں آتا تھا۔

''تو پھر اس گیت کے بارے میں کیا خیال ہے: چلو، خوب پڑھیں؟ یہ تو پہلی

کلاس کے بچوں نے بھی سیکھ رکھا ہے۔'' ماسٹر صاحب چاہتے تھے کہ ان کا سکھایا ہوا کوئی گیت گایا جائے۔ مگر ماسونو زور سے چلّا کر بولی: ''پہاڑی کوا!''

معلوم ہوتا تھا کہ یہ گیت سب کو پسند تھا۔ ماسونو نے فوراً گانا شروع کر دیا۔

''ایک پہاڑی کوّا
میرے لیے لایا
چھوٹا سا لال لفافہ۔''

وہ ابھی پہلی ہی کلاس میں تھی، لیکن اتنی پُر اعتماد اور تجربہ کار معلوم ہوتی تھی کہ کورَس کی قیادت کر سکتی تھی۔ شاید یہ اس کا پیدائشی امتیاز تھا۔ اس میں ایسی صلاحیت تھی کہ دوسروں کو اپنے ساتھ ساتھ گانے پر آمادہ کر سکتی تھی۔

''میں نے اسے کھولا
اس میں لکھا تھا:
جنگل میں لگ گئی آگ
چمکتے چاند کے نیچے۔''

اس دوران گاؤں والوں کا اچھا خاصا ہجوم وہاں اکٹھا ہو گیا تھا اور ہر شخص باری باری مس اوئیشی کو الوداع کہہ رہا تھا۔ مس اوئیشی بچوں کی آواز میں آواز ملا کر گاتی ہوئی کشتی میں سوار ہو گئی۔

''میں نے سوچا خط کا جواب لکھوں
مگر پھر میری آنکھ کھل گئی
میرے بستر کے پاس پڑا تھا
سرخ رنگ کا ایک پتّا۔''

اس گیت کو بار بار دُہرایا گیا، یہاں تک کہ وہ بچوں کے محسوس کیے بغیر خود بخود رک گیا۔ بچوں نے دور ہوتی ہوئی کشتی کی طرف منہ کر کے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ ان کی آوازیں مدّھم پڑتے پڑتے آخر بند ہو گئیں۔

''استانی صاحبہ!''

''پھر آیئے گا!''

''پیر ٹھیک ہو جائے تو واپس آیئے گا۔''

MashalBooks.com

''آئیں گی نا؟ وعدہ کیجئے۔''

''وعدہ! وعدہ!'' یہ آخری آواز نیتا کی تھی۔

وہ اب بھی آوازیں دے رہے تھے، مگر مس اوئیشی کو ان کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

''کتنے پیارے بچے ہیں!'' کشتی والے نے یہ کہہ کر اسے اس کے خیالوں سے چونکا دیا۔ ان سب پر نظریں جمائے جو ساحل سے ہٹنے کو تیار نہ تھے، مس اوئیشی نے کہا: ''ہاں، یہ سب لوگ واقعی بہت اچھے ہیں۔''

''اور پھر بھی سب یہی کہتے ہیں کہ ان لوگوں کے ساتھ گزارا کرنا مشکل ہے۔''

''یہ درست ہے۔ لیکن ایک دفعہ انھیں جان لو تو پھر ان سے اچھے لوگ کوئی اَور نہیں۔''

اپنا چہرہ چمکتے سورج اور سمندر کی خوش گوار ہوا کی طرف کرتے ہوئے مس اوئیشی نے اپنی نظریں مستقل ان لوگوں پر جمائے رکھیں جو اب تِل جیسے چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پورے گاؤں کا نقش اپنے ذہن پر اچھی طرح بٹھا لینا چاہتی ہے۔ سمندر میں دور نکل آنے کے بعد، جب چپوؤں کی آواز کے سوا ساری آوازیں سنائی دینی بند ہو گئیں، بچوں کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں دوبارہ لوٹ آئی۔ ان کی چمکتی ہوئی، گول گول آنکھیں بھی اسے اپنی یادداشت میں صاف نظر آ رہی تھیں۔

MashalBooks.com

کنول کی تصویر

سمندر کا رنگ اور پہاڑیوں کی شبیہ دونوں پہلے کی طرح تھیں۔ بچوں کی ٹولی کھاڑی کے ساتھ ساتھ لمبی پتلی سڑک پر چلتی اب بھی اسی طرح ہر مقام سے ایک ساتھ گزرتی تھی۔ مگر ذرا غور سے دیکھنے پر پتا چل جاتا کہ ٹولی میں اب کچھ نئے چہرے شامل ہو گئے ہیں، اور شاید اُنھیں کی وجہ سے بچوں کا تاثر اتنا ہی تر و تازہ تھا جیسے ان کے آس پاس لگے ہوئے پیڑ تر و تازہ تھے۔ اس ٹولی میں اب تاکے ایچی، ایسو کیچی، کیچی جی بھی شامل تھے اور ماسونو اور سانائے بھی پیچھے چلتی آ رہی تھیں۔ لیکن ان چہروں کو دیکھ کر یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری کہانی کی ابتداء سے اب تک چار سال گزر چکے ہیں۔ کیا 'دس کروڑ ہم وطن، متحد متحد'' کی دُھن پر چلتے ان بچوں کی زندگی اب بھی چار سال پہلے کی طرح تھی؟ سمندر کے رنگ اور پہاڑیوں کی شبیہ کی طرح جنھوں نے ان کے گاؤں کو گھیر رکھا تھا؟

بچوں کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ تو اپنی ہی مسرتوں اور دکھوں کے ساتھ بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ فطری انداز میں بڑے ہو رہے تھے، یہ محسوس کیے بغیر کہ وہ تاریخ کے ایک زبردست ریلے کی زد میں ہیں۔ پچھلے چار برسوں میں کئی اہم واقعات پیش آ چکے تھے، لیکن یہ بچے ابھی ان واقعات کی معنویت کو ٹھیک طرح سمجھ پانے کی عمر تک نہ پہنچے تھے۔ تاہم، ان چھوٹے بچوں کے ذہنوں کی پہنچ کے باہر، تاریخ بنائی جا رہی تھی۔ اب سے چار سال پہلے، مارچ ۱۹۲۸ کی پندرہ تاریخ کو، راس کے گاؤں میں ان بچوں کے داخل ہونے سے چند روز پہلے، اور دوسری.....اس سے اگلے برس سولہ اپریل کو، جب یہ بچے دوسری کلاس میں پہنچے تھے، ان کے بہت سے جاپانی ہم وطن جنھوں نے عوام کے لیے آزادی کا مطالبہ کیا اور اصلاحات کے نقشے پر مرتب کیے، ترقی پسندانہ خیالات کی مخالف حکومت کے ہاتھوں قید خانوں میں ڈال دیے گئے تھے۔ مگر راس کے

MashalBooks.com

گاؤں والے بچوں کو اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ ان کے ذہنوں پر اگر کسی شے کا گہرا نقش قائم تھا تو وہ تھی معاشی کساد بازاری۔ ظاہر ہے وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ یہ ایک عالم گیر رجحان ہے، لیکن ایک بات وہ بخوبی سمجھتے تھے: کہ اس کساد بازاری کے پیدا ہونے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے، اور یہ کہ ان حالات میں ہر ایک کو نہایت کفایت شعاری سے کام لینا ہوگا۔ شمالی ہونشو اور ہوکائیدو کے علاقوں میں قحط پڑنے کی خبریں ان تک پہنچ چکی تھیں اور ان میں سے ہر بچے نے اسکول میں ایک ایک سِین امدادی چندے میں دیا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگر منچوریا اور سنگھائی کے واقعات پیش آئے اور راس کے متعدد جوان آدمیوں کو لام پر جانا پڑا۔

جب یہ واقعات ایک ایک کر کے تیزی سے رونما ہو رہے تھے، یہ کم سن بچے چاولوں میں جَو ملا کر کھانے پر مجبور تھے اور ذہین اور مسرور بچوں کو طرح بڑھے ہو رہے تھے۔ وہ اُن واقعات سے یکسر بے خبر تھے جو آگے چل کر پیش آنے والے تھے۔ وہ تو بس خوش تھے اور بڑے ہو رہے تھے۔

وہ اب پانچویں کلاس میں پہنچ گئے تھے، لیکن ان کے والدین کے پاس انھیں ربر کے جوتے خرید کر دینے کے پیسے نہیں تھے جن کا آج کل رواج تھا۔ تاہم بچوں نے اس پر کوئی شکایت نہ کی، اور اس کا ذمے دار کساد بازاری کو ٹھہرایا جس پر ان کا بس نہ چلتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے تنکوں کی بنی چپلیں ہی پہننے پر اکتفا کیا، اور آج ان کے پیروں میں تازہ بنی ہوئی چپلیں تھیں اس لیے ان کے دل خوش تھے۔ پھر بھی جب انھوں نے دیکھا کہ اکیلے تاداشی نے ربر کے جوتے پہن رکھے ہیں تو وہ ان جوتوں کو دیکھ دیکھ کر آپس میں بحث کرنے لگے۔

''اُف، یہ ناکو! تمھارے پیر کتنے چمکدار ہو رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میری تو آنکھیں چُندھیا رہی ہیں!''

تاداشی اپنے ان جوتوں پر پہلے ہی جھینپ رہا تھا۔ اب جب اس کے دوستوں نے باقاعدہ ان کا ذکر کر دیا تو وہ اتنا گھبرایا کہ اسے یہ جوتے پہن کر آنے پر پچھتاوا ہونے لگا۔

لڑکیوں میں صرف کوتسو وایسی تھی جس کے پاس ربر کے جوتے تھے۔ مگر وہ اس قدر ڈھیلے تھے کہ ہر قدم پر اترنے لگتے تھے۔ آخر اس نے انھیں اتار کر ہاتھوں میں اٹھا لیا

اور ننگے پیر کھڑے ہو کر اُداسی سے ان کو تکنے لگی۔ چھٹی کلاس کی ایک لڑکی نے انھیں اپنی تنکوں کی چپلوں سے بدلنے کی پیش کش کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا:

''ارے، یہ تو سات نمبر کے ہیں، میرے بھی نہیں آئیں گے۔''

کوتسورو کے والدین نے یہ جوتے شاید اس امید میں خریدے تھے کہ وہ انھیں تین ایک سال تک پہن سکے گی۔ مگر اب کوتسورو ان جوتوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ چپلیں پہن کر چلنا زیادہ آسان تھا۔ جب اس کے منہ سے سکون کا سانس نکلا تو ماتسوئے نے مسکرا کر اس سے کہا: ''دیکھو، کوتسورو، میرا کھانا ابھی تک گرم ہے''، اور اپنے ڈبے کو تھپتھپایا جو اس کے پہلو میں لٹک رہا تھا۔

''کون سا ہے، جس پر کنول کے پھول کی تصویر بنی ہوئی ہے؟'' کوتسورو نے پوچھا۔ اُس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کہہ رہی ہو: تمھیں یہ مل کہاں سے گیا؟

ماتسوئے نے جواب دیا: ''نہیں، کنول والا نہیں ہے۔ وہ تو ابّا کل خریدیں گے۔''

وہ اپنے ہی اس جواب پر چونک پڑی۔ تین دن پہلے جو کچھ ہوا تھا وہ اچانک اس کی یادداشت میں تازہ ہو گیا۔ اس نے سنا تھا کہ میسا کو اور ماسونو کے پاس ایلومائٹ کے بنے کھانے کے ایسے ڈبے ہیں جن کے ڈھکنوں پر کنول کے پھول کی تصویر ہے، اور اپنی امّی سے فرمائش کی تھی: ''امّی، ماہچان اور میسان دونوں کے پاس کنول کے پھول والے ڈبے ہیں۔ مجھے بھی ایسا ڈبا لے دیجئے نا!''

''اچھا۔''

''لے دیں گی؟ سچ مچ؟''

''ہاں، سچ مچ۔''

''کنول کے پھول والا، ہیں؟''

''کنول یاد اوَدی، جو تم چاہو۔''

''تو پھر گھنٹی والے سے کب کہیں گی؟''

''کہہ دوں گی۔ اب اتنا بے صبرا پن منت دکھاوَ۔''

''مگر آپ نے وعدہ تو کر لیا ہے۔ میں جا کے گھنٹی والے سے کہہ دوں؟''

اس پر ماتسوئے کی امّی کو ذرا سنجیدہ ہونا پڑا۔ اس بار انھوں نے ''اچھا'' نہیں

کہا، بلکہ ذرا تیز لہجے میں بولیں: ''ابھی ٹھہرو ایک منٹ۔ پیسے کون دے گا؟ ابھی صبر کرو، جب تمھارے ابّا کے پاس اتنے پیسے ہو جائیں گے تو منگوالیں گے۔ ابھی سے کہہ دیا تو بعد میں شرمندگی ہوگی۔ ابھی میں تمھیں ایسا ڈبا دے دیتی ہوں جو ایلومائٹ والے ڈبے سے بھی اچھا ہے۔

یوں ماتسوئے بہل گئی۔ مگر جب اس کی امّی نے اسے لکڑی کا بنا پرانا ڈبا دکھایا جو اس کے واسطے ڈھونڈ کر نکالا گیا تھا تو وہ مایوسی سے رونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ لکڑی کے ڈبے اب بالکل مقبول نہیں رہے اور کوئی بھی انھیں استعمال نہیں کرتا۔ کساد بازاری سے اس کے ابّا کا کاروبار بھی متاثر ہوا تھا، اور جب انھیں بڑھئی کا کوئی کام نہ ملتا تو وہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے لگتے، مثلاً باغ میں نلائی کا کام۔ اس لیے ماتسوئے کو معلوم تھا کہ ایک نیا ڈبا خریدنا بھی ان کی طاقت سے باہر ہے۔ لیکن اُسے نئے ڈبے کی سخت ضرورت تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے یہ پرانا، لکڑی کا ڈبا قبول کر لیا تو اسے نیا، کنول کے پھول والا ڈبا کبھی نہیں ملے گا۔ اس لیے وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور آخر رونے لگی۔ لیکن اس کی امّی بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھیں۔

''بہت خراب حالات ہیں، تم جانتی ہی ہو۔ تھوڑا سا صبر کرو۔ اگر تمھارے ابّا کا کاروبار اگلے مہینے کچھ بہتر ہو گیا تو تمھیں نیا ڈبا ضرور دلوا دیں گے۔ ماتسوئے، تم سب سے بڑی ہو، تمھیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

مگر بچی سسکیاں بھرتی رہی۔ شدید مایوسی کے عالم میں وہ یوں رو رہی تھی جیسے کبھی چپ نہیں ہوگی۔ تب ایک عجیب بات ہوئی، عجیب اور سنگین۔ ''ماتسوئے،'' اس کی ماں نے زور سے کہا، ''میں دِلوا دوں گی ڈبا۔ وعدہ کرتی ہوں۔ قسم کھاتی ہوں۔ اب تم بھاگ کر جاؤ اور دائی کو بلا لاؤ۔ راستے میں رک کر دکان والی سے کہنا کہ وہ بھی فوراً چلی آئیں۔ ارے، میرے خدا، یہ مجھے کیا ہو رہا ہے!''

یہ آخری فقرہ انھوں نے منہ ہی منہ میں اپنے آپ سے کہا، اور پچھلے کمرے میں جا کر اپنا بستر بچھانے لگیں۔ ماتسوئے نے اپنی امی کو یہ کرتے دیکھا تو اپنی ضد چھوڑ کر رونا بند کر دیا اور جلدی سے گھر سے باہر نکل آئی۔ ننھی لڑکی تیر کی سی تیزی سے دوڑ رہی تھی اور اس کے دل میں ایک خوش گوار توقع جنم لے رہی تھی۔ امّی کے وعدے نے اسے امید بخش دی تھی۔

MashalBooks.com

دائی کا گھر گاؤں میں داخلے کے مقام کے پاس تھا۔ ماتسوئے نے واپسی میں کچھ فاصلہ دائی کی سائیکل پر پیچھے بیٹھ کر طے کیا۔ جب سائیکل چڑھائی کے قریب پہنچی تو دائی نے سائیکل روک کر کہا: ''تم یہاں اتر جاؤ۔ مجھے فوراً پہنچنا ہے۔''

ماتسوئے نے اثبات میں سر ہلایا اور اتر کر سائیکل کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی جو بہت تیز چل رہی تھی اور تھوڑی دیر میں پہاڑیوں کے پیچھے اُس کی نظر سے اوجھل ہوگئی۔ مس اوئیشی کی سائیکل سواری کے بعد سے سائیکل سوار عورتوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ افاضہ ہوتا رہا تھا، اور اب انھیں عجیب مخلوق نہیں گردانا جاتا تھا۔ دائی کی سائیکل کو تیزی سے آگے بڑھتا دیکھ کر ماتسوئے کو اچانک خیال آیا کہ اگر اس کے ابّا کے پاس بھی سائیکل ہوتی تو اُن کا کام کتنا آسان ہو جاتا۔ انھیں ہر صبح بہت سویرے اٹھ کر پیدل کام پر شہر جانا پڑتا تھا۔

جب ماتسوئے دوڑتی ہوئی گھر پہنچی تو پیدائش ہو چکی تھی۔ دکان کی مالکہ، جس نے اپنے کیمونو کی آستینیں اوپر اٹھا کر ڈوری سے باندھ رکھی تھیں اور پانی بھرنے میں مصروف تھی، ماتسوئے کو دیکھتے ہی بولی: ''ماتچان بیٹی، تم سے کام کرنے کو کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا، مگر ذرا جلدی جا کر پانی گرم کرنے کے لیے آگ جلا دو۔''

بالٹی میں سے پانی کو گرم کرنے کے برتن میں ڈالنے کے بعد اس نے دبی آواز میں بتایا: ''بہت چھوٹی بچی ہے، سَتوانسی۔ مگر خیر، اس سے کیا ہوتا ہے۔ شاید تمھارے ابّا کو مایوسی ہو کہ ایک اَور لڑکی آ گئی، مگر لڑکیوں کا پیدا ہونا اچھا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، لڑکیاں فوج میں نہیں جا سکتیں، مگر کیا پتا دس سال میں ہمارا ملک ترقی کر کے کہاں سے کہاں جا پہنچے۔''

ماتسوئے کو بڑی بی کی بات سمجھ میں نہ آئی اور وہ چولھا سلگانے میں لگی رہی۔ جب کبھی امّی کی طبیعت خراب ہوتی تو ماتسوئے ہی کو کھانا پکانا پڑتا تھا۔ اس کی دادی یا نانی تو تھیں نہیں۔ یہ معمول اُس وقت سے تھا جب وہ بہت چھوٹی تھی۔

آج، اُس واقعے کے تین دن بعد، ماتسوئے پہلی بار بڑے اسکول جا رہی تھی، اور وہ بھی دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر۔ اس نے دیگچی میں سے بھاپ اُگلتے چاول اپنے اور اپنے ابّا کے کھانے کے ڈبوں میں نکالے تھے اور امّی پچھلے کمرے میں بستر پر لیٹی اُسے ہدایات دیتی رہی تھیں۔

''اپنے ابّا کے ڈبے میں چاول اوپر تک بھر دینا۔ لیکن اپنا ڈبا پورا مت بھرنا۔ بہت بڑا ڈبا۔ زیتون کے اچار کا ایک دانہ چاولوں میں رکھ کر اس کے اوپر اَور چاول ڈال

دینا تا کہ وہ دکھائی نہ دے۔ ورنہ ڈھکنے میں سوراخ ہو جائے گا۔

ماتسوئے کی امّی اپنے دُکھتے ہوئے سر پر رومال باندھے لیٹی ہوئی تھیں اور مارے تکلیف کے بے ہوش ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ مگر ماتسوئے کی توجہ اپنی امّی کی تکلیف کی طرف نہیں تھی۔

''امّی، آپ مجھے کنول والا کھانے کا ڈبا سچ مچ دلا دیں گی نا؟ کب دلائیں گی؟''

''جب میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

''جس دن آپ بستر سے اٹھیں گی اُسی روز؟''

''ہاں، اُسی روز۔''

ماتسوئے آج اتنی خوش تھی کہ اسے اپنے ابّا کے المونیم کے ڈبے میں کھانا لے جانے پر بھی افسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بڑا سا خوب گہرا ڈبا تھا جس میں ماتسوئے کی عمر کی تین لڑکیوں کا کھانا سما سکتا تھا، لیکن اُسے یہ خیال نہ آیا کہ پرائمری اسکول کے کلاس روم میں بستے سے باہر نکالنے پر یہ ڈبا کتنا عجیب لگے گا۔ لکڑی والے ڈبے کے مقابلے میں یہ اسے بہتر لگتا تھا۔ اس کے علاوہ، اس ڈبے کی گرمی نہ صرف اس کے بدن تک بلکہ اس کے دل تک پہنچ رہی تھی، اور وہ خوش تھی۔ کوتسورو کے سوال کے جواب میں ماتسوئے نے سوچے بغیر کہہ دیا تھا: ''کل''، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ شاید اتنی جلد ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ''ویسے شاید پرسوں دلوا دیں،'' اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ وہ اپنے دل میں یہی خوش کن خیال لیے چل رہی تھی۔ باقی سب بچے بھی اپنی اپنی چیزوں کے خیال میں مگن اور خوش تھے۔ ماسونو نے جو نیا، ململ حوں والا بلاؤز پہن رکھا تھا، اس پر نازاں تھی، کوتوئے کو اپنے چپلوں پر وہ لال دھاریاں اچھی لگ رہی تھیں جو اس کی دادی اماں نے بنائی تھیں، سانائے کو، جس نے سفید چھوٹے خانوں میں استر والا کیمونو پہن رکھا تھا۔ جو شاید کالج میں پڑھنے والی لڑکی کے لیے زیادہ مناسب ہوتا۔۔ رہ رہ کر اپنے کیمونو کے سُرخ استر کا خیال آ رہا تھا اور وہ بار بار اس کی آستینوں پر نظر ڈالتی تھی۔ جب اس نے یہ کیمونو پہلی بار پہن کر دیکھا تو اس کی امّی نے، اس سے پہلے کہ کوئی اَور اس کے صوفیانہ پن پر اعتراض کرے، اس سے کہا تھا: ''اس پر بنا ہوا نمونہ تم سے بڑی عمر کی لڑکیوں پر زیادہ اچھا لگتا، مگر سرخ

استر کی وجہ سے ٹھیک لگ رہا ہے۔ بہت پھب رہا ہے، سانائے۔ اسے پہن کر تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اور آستینوں میں سے استر بھی جھلک رہا ہے۔ بہت پیارا کیمونو ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔''

اس کی امی نے کیمونو کی اتنی تعریفیں کیں کہ سانائے کو فوراً یقین آ گیا۔ بچوں کی اس ٹولی میں صرف سانائے اور کوتوئے کیمونو پہنے تھیں۔ سانائے کی طرح کوتوئے کا کیمونو بھی شاید اس کی امی کا تھا۔ اس سُوتی کیمونو کی گہری زمین پر کہیں کہیں سفید ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ اسے کاٹ کر دوبارہ نہیں سیا گیا تھا، اور کندھوں اور کولھوں پر اس کے مڑے ہوئے حصے صاف نظر آ رہے تھے۔ مگر وہ اپنی سرخ دھاریوں والی چپلوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ جب بچے بانس کے جنگل کے پاس کی جھاڑیوں کے برابر سے گزرے تو صرف کوتوئے کو مس اوئیشی کی یاد آئی اور اس نے اُس پار صنوبر والے گاؤں کی طرف دیکھا جہاں مس اوئیشی کا گھر تھا۔

''مس کوئیشی!'' کوتوئے نے اپنی استانی کی عرفیت کو چپکے سے اپنے دل میں دُہرایا، مگر کوتسورو اس کی طرف یوں بڑھی جیسے اس نے سُن لیا ہو۔

''تمھیں مس کوئیشی کی خبر معلوم ہے؟''

''کون سی خبر؟''

یہ جان کر کہ کوتوئے کو نہیں معلوم، کوتسورو نے سانائے سے کہا: ''تمھیں پتا ہے سانائے؟''

''کیا؟''

کوتسورو نے بڑے فخر سے ایک ایک بچی کی طرف دیکھا اور زور سے پوچھا: ''تم لوگوں کو مس کوئیشی کی خبر معلوم ہے؟''

خبریں ہمیشہ کوتسورو ہی کے ذریعے سے پہنچتی تھیں۔ بچیوں نے فوراً اسے گھیر لیا۔ کوتسورو اپنی سکڑی ہوئی آنکھوں سے، جو زور سے کھولنے پر بھی سکڑی رہتی تھیں، ایک ایک بچی کو بڑے فاتحانہ انداز سے دیکھتی رہی۔

''مس کوئیشی.....ان کی..... ان کے بارے میں ایک خوش خبری ہے۔'' پھر اس نے ماسونو کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ وہ اس راز کو اپنے اور ماسونو تک ہی رکھنا چاہتی تھی، مگر ماسونا چلّا کر بول اٹھی: ''اوہو! تو اُن کی شادی ہو گئی!''

MashalBooks.com

''اور اس کے بعد،'' کوتسورو اتنا کہہ کر رک گئی، جیسے جتانا چاہتی ہو کہ خبر ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ ''اس کے بعد وہ دونوں ..... خیر، وہ دونوں ہنی مون کے لیے..... پتا ہے کہاں گئے؟''

''کہاں؟ کہاں؟''

''کہاں گئے؟''

''کوم ..... پی .....را؟''

''میں سمجھ گئی، کومپیرامندر۔''

''بالکل ٹھیک!''

سب بچے جوش کے مارے چلّا اٹھے۔ بڑی کلاسوں کے لڑکوں نے، جوان سے کوئی سو گز آگے نکل چکے تھے، مڑ کر انھیں دیکھا لیکن رکے نہیں، چلتے رہے۔ پانچویں کلاس کی بچیاں ان کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلنے لگیں مگر آپس میں زور زور سے ''مسز اوئیشی'' کے بارے میں باتیں کرتے رہیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ شادی چند دن پہلے ہوئی ہے اور کوتسورو کے ابّا یہ خبر کل ہی لائے ہیں۔ ماسونو کا خیال تھا کہ شادی کے بعد مسز اوئیشی شاید اسکول میں پڑھانا چھوڑ دیں گی۔ کوتسورو کا بھی یہی خیال تھا اور اس نے سب کو یاد دَلایا کہ ان سے پچھلی استانی، مس کوبایاشی، نے بھی اس لیے اسکول چھوڑا تھا کہ اُن کی شادی ہونے والی تھی۔ سب سے پہلے یہ کہنے والی بھی ماسونو ہی تھی کہ اگر مسز اوئیشی اسکول نہ چھوڑیں تو کتنا اچھا ہو۔ اس بات سے سانائے اور کوتوئے تک نے اتفاق کیا۔

''ہمیں ایک بار پھر چل کر مس اوئیشی سے ملنا چاہیے۔ ٹھیک ہے نا؟'' سانائے نے کوتسورو سے کہا۔

''اَور کہا! پچھلی دفعہ انھوں نے کتنے مزے دار نُوڈل کھلائے تھے!'' کوتوئے بولی۔ باقی سب کو بھی چار برس پہلے کی بات فوراً یاد آ گئی، اور اچانک ان میں اس سوال پر سرگرم بحث چھڑ گئی کہ آج مس اوئیشی اسکول میں ہوں گی یا نہیں۔ اس پر ان کے قدم نادانستہ طور پر تیز ہو گئے۔ ماسونوئے تقریباً دوڑتے ہوئے تجویز پیش کی: ''شرط لگائیں؟ مس اوئیشی اسکول میں ہوں گی یا نہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ کیا شرط لگاتی ہو؟'' کوتسورو نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔

MashalBooks.com

اگر تم ہار گئیں تو .....تو..... میں تمھارے سر پر پانچ چپت لگاؤں گا،'' تاداشی بولا۔

''چلو پھر تو میں ہارنے سے نہیں ڈرتی۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ وہ اسکول میں ہوں گی،'' ماسونو نے اپنا سیدھا ہاتھ ہوا میں اٹھا کر کہا۔

''میں بھی!''

''میں بھی!''

ایک ایک کر کے سب نے یہی کہا کہ مسز اوئیشی آج اسکول آئیں گی، چناں چہ شرط نہ لگائی جا سکی۔ اس دوران اسکول نزدیک آتا گیا۔ بڑے اسکول میں پہلی بار آتے ہوئے پانچویں کلاس کے بچے بڑی سنجیدگی سے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ پھر انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسٹاف روم کی کھڑکی میں مسز اوئیشی کھڑی ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے ہاتھ ہلا کر بچوں کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

''مجھے تم لوگوں کا اتنا انتظار تھا۔ ایک منٹ ٹھہرو،'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئیں۔ وہ بچوں کے آگے آگے چلتی ہوئی ان کو دریا کے کنارے لے گئیں۔ پھر انھوں نے ایک ایک بچے کا چہرہ دیکھا اور کہنے لگیں: ''تم سب تو بہت بڑے ہو گئے۔ بہت جلد میرے قد کے برابر آ جاؤ گے۔ افوہ، کوتسورو، تم تو مجھ سے بھی لمبی ہو گئیں!''

وہ کوتسورو کے برابر میں آ کھڑی ہوئیں۔ ''واقعی، تم مجھ سے بڑھ گئیں۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ آخر مَیں کوئیشی جو ٹھہری!''

سب ہنس پڑے۔

''جب ایک بار تم نے میرا نام کوئیشی رکھ دیا تو اب میں کبھی اوئیشی نہیں ہو سکتی۔''

وہ سب ایک بار پھر ہنسے لیکن بولے کچھ نہیں۔

''تم سب کتنے خاموش ہو! پانچویں کلاس میں آ گئے ہو، کیا اِس لیے؟''

بچے اس پر بھی خاموشی سے مسکراتے رہے، کیوں کہ مسز اوئیشی پتا نہیں کیوں پہلے سے کچھ مختلف لگ رہی تھیں۔ ان کی جِلد زیادہ نکھری ہوئی تھی اور ان کے آس پاس سے بنفشے کے پھولوں کی سی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ سب جانتے تھے کہ یہ دلھن کی خوشبو ہے۔

''استانی صاحبہ،'' آخر کار ماسونو بولی۔ ''آپ ہمیں موسیقی سکھائیں گی؟''

ہاں، صرف موسیقی ہی نہیں۔ اس سال میں تمھاری کلاس ٹیچر ہوں گی۔''

بچوں نے مسرت سے نعرہ لگایا اور سب ایک دم بولنے اور استانی کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ''استانی صاحبہ! استانی صاحبہ!'' انھوں نے راس کے گاؤں میں ہونے والے واقعات کی اتنی باتیں کیں کہ مسز اوئیشی کو گاؤں کے مکان، کھاڑی کا رنگ سب اپنی آنکھوں سے دکھائی دینے لگا اور تیز ساحلی ہوا اور سمندری جھاگ کا شور اس کے کانوں میں گونج اٹھا۔ کوتوئے کے دادا کا پچھلے دنوں مرگی کے دورے سے انتقال ہو گیا تھا، ایسو کیچی کی امّی کو گٹھیا نے آلیا تھا، سانائے کے ماتھے پر خراشیں پڑ گئیں تھیں کیوں کہ وہ میسا کو کے گلے میں ہاتھ ڈالے اُچھل کود رہی تھی اور لڑکھڑا کر سڑک سے نیچے جا گری تھی، کچن کے گھر میں تین سور ہیضے سے مر گئے تھے اور آج کل اس کی امّی بیمار تھیں..... بچوں کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔

کوتسورو استانی سے لپٹ گئی اور انھیں ہلانے لگی۔ ''آپ کو پتا ہے نیتا کیوں نہیں آیا؟''

''ارے، میں پوچھنے ہی والی تھی۔ کیا ہوا اُسے؟ بیمار ہے کیا؟''

بچوں نے فوراً جواب نہیں دیا بلکہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ مسز اوئیشی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ انھیں اچانک احساس ہوا کہ نیتا نے ضرور کوئی غیر معمولی حرکت کی ہوگی۔

''کیا ہوا اُسے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' مسز اوئیشی نے سانائے سے پوچھا، مگر اس نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا اور نیچے دیکھنے لگی۔

''وہ فیل ہو گیا،'' تیسا کو نے جواب دیا۔

''اوہ واقعی؟'' استانی کو جھٹکا سا لگا۔ انھیں ہنسانے کے لیے کوتسورو نے کہا:

''کیوں کہ اس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی تھی۔''

بچے ہنسنے لگے مگر مسز اوئیشی نہیں ہنسیں۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو تم سب کے سب پہلی کلاس میں فیل ہو جاتے۔ شاید نیتا نے بیماری وغیرہ کی وجہ سے ناغے بہت کیے ہوں گے۔''

''مگر ماسٹر صاحب تو یہی کہہ رہے تھے،'' کوتسورو نے وضاحت کی۔ ''ویسے تو ناک بہنے پر معاف کر دیتے ہیں، لیکن نیتا کی ناک پورے چار سال بہتی رہی۔ ذرا بھی نہیں

رکی۔اس لیے وہ چوتھی کلاس میں رہ گیا۔ ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔''

اس پر بچے پھر کھی کھی کرنے لگے۔ استانی کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو مسکراہٹ آئی، مگر پھر وہ پریشان دکھائی دینے لگیں۔ اسکول شروع ہونے کی گھنٹی بجی اور انھوں نے بچوں کو خدا حافظ کہا۔ اسٹاف روم میں واپس جاتے ہوئے انھیں مسلسل نیتا ہی کا خیال آتا رہا۔'' بے چارہ بچہ،'' انھوں نے منہ ہی منہ میں کہا۔ وہ اس خیال سے اداس ہو گئیں کہ نیتا فیل ہو گیا اور اب اسے چوتھی کلاس کی پڑھی ہوئی چیزیں دوبارہ اپنے چھوٹے بھائی سانگچی کے ساتھ بیٹھ کی پڑھنی پڑیں گی۔ وہ سوچنے لگیں کہ آیا ماسٹر صاحب نے واقعی وہ ناک بہنے والی بات کہی ہوگی۔ انھیں ڈر ہو رہا تھا کہ ایک کلاس پیچھے ہونے سے نیتا کی ناک اَور زیادہ بہنے لگے گی۔ اگر اس ناکامی سے نیتا کی شوخی اور معصومیت ختم ہوگئی تو یہ زندگی بھر کی بدقسمتی ہوگی، مسز اوئیشی نے سوچا۔ انھیں رہ رہ کر پیچھے رہ جانے پر نیتا کی تنہائی کا خیال آ رہا تھا۔'' ویسے تو ناک بہنے پر معاف کر دیتے ہیں،'' وہ اپنے آپ سے دُہراتی رہیں اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر نیتا کیوں فیل ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مسز اوئیشی باہر نکل کر گئیں کہ تاکے ایچی سے معلوم کریں کیا معاملہ ہے۔ وہ بدلے کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر کرکھیل کے میدان پر نظر دوڑانے لگیں۔ تاکے ایچی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بجائے انھیں ماتسوئے دکھائی دی جو پتا نہیں کیوں سب سے الگ تھلگ اسکول کی دیوار سے ٹیک لگائے اکیلی کھڑی تھی۔ مسز اوئیشی کے بلانے پر وہ بھاگتی ہوئی دریا کے کنارے کے پاس پہنچی۔ جب ماتسوائے مسکراتی تھی تو اس کی آنکھیں بالکل اپنی امّی کی سی لگتی تھیں۔ مسز اوئیشی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر آنے میں اس کی مدد کی۔ اس کا شرمایا ہوا چہرہ دیکھ کر مسز اوئیشی کو اس کی امّی کا اَور زیادہ خیال آیا۔ ماتسوئے، اس بات سے بے خبر کہ مسز اوئیشی اس سے نیتا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہیں، بڑی سنجیدگی سے بولی، جیسے اس راز کو مزید چھپا نہ سکتی ہو۔

''استانی صاحبہ!''

''کیا بات ہے؟''

''آں..... بات یہ ہے کہ..... میری امّی کے ہاں بچی ہوئی ہے۔''

''ارے سچ مچ؟ بھئی مبارک ہو! نام کیا رکھا؟''

''نام تو ابھی نہیں رکھا۔ پرسوں ہی تو پیدا ہوئی ہے۔کل، پرسوں، ترسوں.....''
وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں پر حساب کرنے لگی۔''ترسوں اس کا نام رکھا جائے گا۔ مجھے کوئی اچھا سا نام سوچنا ہے۔''

''اچھا؟ تو کوئی نام سوچا؟''

''ابھی نہیں سوچا۔سوچ رہی ہوں،'' ماتسوئے خوشی سے بولی۔

''استانی صاحبہ!'' اس نے ایک بار پھر مسز اوئیشی کو مخاطب کیا جیسے اس بار کوئی اَور بات کرنا چاہ رہی ہو۔

''ہاں؟ تم بہت خوش لگ رہی ہو، ہے نا؟ کیا بات ہے؟''

''امی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس روز بستر سے اٹھیں گی اُسی روز مجھے ایلومائٹ کا کنول کے پھول کی تصویر والا کھانے کا ڈبا دلائیں گی۔'' ماتسوئے نے گہرا سانس لیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کنول کے پھول والا ڈبا؟ کتنا خوب صورت ہوگا! ارے ہاں، کیا تم اپنی ننھی بہن کا نام بھی کنول کے نام پر رکھنا چاہتی ہو؟''

''ابھی مجھے پتا نہیں۔''

''پتا نہیں؟ تو اب سن لو۔اس کا نام کنول کے نام پر رکھنا: یورکو، یوری؟ مجھے تو یوری زیادہ پسند ہے۔ یوریکو تو آج کل بہت عام نام ہے۔''

ماتسوئے نے تائید میں سر ہلایا اور آنکھیں اٹھا کر خوشی سے مسز اوئیشی کے چہرے کو دیکھا۔مسز اوئیشی کو لگا کہ انھوں نے ماتسوئے کی آنکھوں کی نزاکت کو پہلی بار محسوس کیا ہے، اور وہ اس کی کالی آنکھوں اور لمبی پلکوں کو پیار سے دیکھنے لگیں۔نیتا کے لیے فکرمند ہوتے ہوئے بھی، مسز اوئیشی نادانستہ طور پر، اچانک خوش ہوگئیں۔اُدھر ماتسوئے ان سے بھی کئی گنا زیادہ خوش تھی۔اس نے مسز اوئیشی کو نہیں بتایا، مگر کھانے کے وقفے میں جب اس نے اپنا بڑا سا المونیم کا ڈبا نکالا تو کوتسورو اور میسا کو نے اس کا بہت مذاق اڑایا تھا۔اسی لیے وہ کچھ دیر پہلے سب سے الگ تھلگ، اکیلی کھڑی تھی۔مگر اب اس کی خوشی لوٹ آئی تھی جیسے گرمیوں کی صبح کو مرجھائی ہوئی گھاس اوس پڑنے پر دوبارہ تروتازہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس خیال سے بہت خوش تھی کہ مسز اوئیشی نے خاص طور پر اسے بلا کر اس سے اتنی اچھی باتیں کی تھیں۔اس نے طے کیا کہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گی۔

MashalBooks.com

لیکن اس روز اسکول سے گھر واپس جاتے ہوئے یہ بات بے دھیانی میں اس کے منہ سے نکل گئی۔

''میں اپنی بہن کا نام یوری رکھوں گی۔''

''یوری؟ یوری کیا؟ یوریکو زیادہ اچھا نام ہے۔'' کوتسورو نے تبصرہ کیا۔

ماتسوئے نے فخر سے سر اونچا کیا۔ ''لیکن مس کوئیشی کہہ رہی تھیں کہ یوری زیادہ اچھا ہے، کیوں کہ یوریکو تو بہت عام نام ہے۔''

کوتسورو نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کیا؟ مس کوئیشی کیوں؟'' اس نے ماتسوئے کے چہرے کو بڑے تجسس کے ساتھ دیکھا۔ ''اچھا، میں سمجھ گئی،'' اس نے کہا۔ پھر اس نے میسا کو کو جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ پھر باری باری فوجیکو، سانائے اور کوتوئے کے کان میں کوئی بات کہی، اور زور سے پوچھنے لگی: ''کیوں، ٹھیک ہے نا؟''

مگر تینوں خاموش طبع لڑکیوں نے خاموشی اور تذبذب کے ساتھ سر ہلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، جس سے کوتسورو کا ماتسوئے کو الگ تھلگ کرنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ ماسونو، جو ہمیشہ اس کا ساتھ دیتی تھی، آج قصبے میں اپنی امّی کے ریستوراں پر رک گئی تھی اور اس وقت ساتھ نہیں تھی۔ ماسونو نے تینوں لڑکیوں کے کان میں کہا تھا کہ ضرور ماتسوئے نے مسز اوئیشی کی خوشامد کی ہو گی تبھی وہ اس پر اتنی مہربان ہوئیں۔ آخر جب کسی نے کوتسورو کو ساتھ نہ دیا تو وہ بددل ہو کر آگے آگے چلنے لگی۔ باقی سب لڑکیاں خاموشی سے اس کے پیچھے آتی رہیں۔

جب وہ ایک موڑ کے پاس پہنچے تو کوتسورو اچانک ان کے آگے کھڑی ہو گئی اور سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ باقی سب نے بھی بے اختیار اُدھر دیکھا۔ پھر کوتسورو دوبارہ چل پڑی اور وہ سب بھی اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ مگر ذرا دیر بعد جب سمندر پر ان کی نظر پڑی تو ان کے قدم آگے بڑھنا بھول گئے۔

کیا کتسورو کو پہلے سے پتا تھا؟ یا اسے بھی ابھی ان سب کے ساتھ معلوم ہوا تھا؟ موسمِ بہار کے پرسکون سمندر پر ایک ماہی گیری کی کشتی تیز رفتار سے آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔ دو آدمی، اوپر کے دھڑ سے ننگے، سروں پر رومال باندھے، پوری قوت سے چپو چلا رہے تھے۔ کشتی کا رُخ کھاڑی کے اُس پار والے قصبے کی طرف تھا اور اس کے چپوؤں

کے چلنے سے جھاگ کی ایک چوڑی سی پٹی کشتی کے پیچھے پانی میں بنتی چلی جا رہی تھی۔ لڑکیاں اپنے جھگڑے کو بھول بھال گئیں۔

''ارے، یہ کیا ہے؟''

''کیا کسی کے گھر میں کوئی بات ہوگئی ہے؟''

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کشتی کے پیچھے چلتی جھاگ کی چوڑی سفید پٹی کو دیکھ کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ راس کے گاؤں میں کوئی بُری بات پیش آ گئی ہے۔ شاید کسی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہو۔ انھوں نے کشتی پر ایک بستر بچھا ہوا دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اس پر کوئی لیٹا ہوا ہوگا۔ لیکن کشتی اتنی تیزی سے آگے نکل گئی کہ وہ بالکل نہ دیکھ سکیں۔ کشتی کسی خواب کی طرح آ کر نکل گئی تھی، مگر انھیں معلوم تھا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ انھیں وہ حادثے یاد آئے جو اس سے پہلے ہوئے تھے۔ ایک آدھ سال میں ایک بار ضرور ایسا ہوتا کہ کسی بیمار پڑنے والے کو فوراً قصبے کے اسپتال لے جانا پڑتا۔ ایک بار مسز اوئیشی کو بھی اسی طرح لے جایا گیا تھا۔ کیا کسی کو چوٹ لگ گئی ہے یا پیٹ میں زور کا درد اٹھا ہے؟

''کیا بات ہے؟''

''کسی کو اپنڈکس کا درد ہوا ہوگا۔''

لڑکے بھی ان کے ساتھ آ ملے تھے اور ٹولی کی شکل میں کھڑے قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ لڑکیاں خاموش رہی اور جو لڑکا بولتا اس کی شکل دیکھنے لگتیں۔ اس دوران ماتسوئے کو یاد آیا کہ آج صبح جب وہ گھر سے نکل تو اس کی امّی بہت بیمار لگ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو اس پر سراسیمگی چھا گئی جیسے اس کے ذہن پر کوئی تاریک سایہ تیر گیا ہو، مگر پھر اس نے مضبوطی سے اس خیال کو جھٹک دیا اور خود سے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود اس کی تشویش پوری طرح دور نہ ہوئی کیوں کہ اسے یاد تھا کہ اس کی امّی آج صبح کیسے کراہ رہی تھیں۔ انھوں نے شدید سر درد کی وجہ سے ماتھے پر رومال اتنا کس کر باندھا تھا کہ ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ انھوں نے اپنے شوہر سے کہا بھی تھا کہ آج کام پر نہ جائیں، مگر وہ آج چھٹی نہیں کر سکتے تھے۔

''آج ماتسوئے کو روک لیتے ہیں،'' ابّا نے کہا تھا۔

''نہیں نہیں، جانے دو،'' اس کی امّی نے جواب دے کر ماتسوئے سے کہا تھا:

''آج پہلا دن ہے؟ تم اسکول چلی جاؤ، مگر دیکھو، سیدھی گھر آنا، ٹھیک ہے؟''

جب ماتسوئے کو یہ بات یاد آئی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ایک دم گھر کی طرف بھاگ اٹھی۔ باقی بچے اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ ماتسوئے بے تحاشا دوڑتی رہی، یہاں تک کہ تھکن کے مارے لڑکھڑانے لگی۔ جس وقت وہ اس مقام پر پہنچی جہاں سے گاؤں کے گھروں کی قطاریں دکھائی دینا شروع ہوتی تھیں، اس کے گھٹنے لرز رہے تھے اور وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سب سے پہلے دکان والا گھر پڑتا تھا، اور اس سے ذرا آگے اس کا گھر تھا۔ رسی پر لٹکے ہوئے ننھی بچی کے کپڑوں کو ہوا میں ہلتے دیکھ کر اسے سکون ہوا۔ خدشات کا بوجھ اچانک اس کے اوپر سے اٹھا تو اسے رونا سا آ گیا، لیکن اگلے ہی لمحے اسے پتا چلا کہ کنویں کے پاس اس کی امّی نہیں بلکہ دکان والی بڑی بی ہیں۔ وہ تیر کی طرح بھاگتی ہوئی اپنے گھر میں داخل ہوئی اور اسی تیزی سے پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی امّی کو یہیں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ یہاں نہیں تھیں۔

''امی!''

کوئی جواب نہ آیا۔

''امی!'' وہ آنسوؤں سے رُندھی آواز میں چلّائی۔ دکان والی سمت سے کسی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

''نہیں، نہیں! امّی!'' وہ پوری آواز سے چیخ کر رونے لگی۔ اس کی آواز اوپر آسمان تک اور باہر سمندر تک پہنچ رہی تھی۔

MashalBooks.com

کیکڑے اور چاندنی

پانچویں کا کلاس روم اسکول کی نئی بنی ہوئی عمارت میں داخل ہونے کے دروازے کے بالکل ساتھ ہی تھا اور اسکا رُخ دریا کی طرف تھا۔ کھڑکیوں کے باہر ایک زمین کا ایک تنگ، مستطیل خالی قطعہ تھا اور اس کے پار پتھر کی اونچی مصنوعی پہاڑی تھی جسے دریا کے پاٹ کے عمود میں بنایا گیا تھا۔ زمین سے تین فٹ اونچا ایک بند بنایا گیا تھا جس کا مقصد حادثوں سے بچاؤ کرنا تھا، لیکن یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ بچے کلاسوں کے درمیان کے چھوٹے سے وقفے میں بھی بلا تکلف بند پر چڑھ کر دریا کے پاس تک چلے جاتے تھے۔ ان میں زیادہ تر لڑکے ہوتے تھے۔ پانی صاف تھا کیوں کہ جس طرف سے دریا بہہ کر آ رہا تھا وہاں مکانات نہیں تھے۔ یہ دریا پہاڑوں سے نکلتا تھا اور اسکول تک پہنچتے ہوئے حیرت انگریز طور پر شفاف اور خنک رہتا تھا جہاں انسانی لمس سے اس کی پہلی بار ملاقات ہوتی۔ بچے دریا کے پانی سے اپنے ہاتھ اور پیر بھگو کر ہی مکمل طور پر مطمئن ہو جاتے تھے۔ یہیں آ کر دریا کے پانی کی پاکیزگی انسانی لمس سے آلودہ ہوتی تھی۔ جب سے کسی نے افواہ اڑائی تھی کہ دریا میں بام مچھلیاں ہیں، بچوں کی ساری توجہ دریا کی تہہ پر مرکوز ہو گئی تھی، اور کنارے پر کھڑے تماشائیوں اور دریا میں سے گزرتے ماہی گیروں کے درمیان مسلسل بحث ہوتی رہتی تھی۔ بچے دریا کی تہہ میں پڑے پتھروں کو الٹ پلٹ کیا کرتے اور بام مچھلیوں کو ڈھونڈتے رہتے جو کبھی کسی کے ہاتھ نہ آئیں۔ انھیں صرف کیکڑے ملا کرتے۔ ناکامی کے باوجود اس کھیل میں انہیں مزہ بہت آتا۔ نتیجہ یہ کہ ماہی گیروں اور تماشائیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ پانی صرف گھٹنوں تک تھا اور اس میں کھیلنا خطرناک نہیں تھا۔ اس لیے مسز اوئیشی بچوں کو دیکھتی رہتیں اور کچھ نہ کہتیں۔

''مسز اوئیشی، آپ کو ایک کیکڑا چاہیے؟'' تاداشی نے اپنا بازو ان کی طرف پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ اپنے ہاتھ میں اس نے ایک کیکڑے کو اس کی ٹانگوں کے بالوں سے پکڑ رکھا تھا جن کا رنگ گدلا بھورا تھا۔

''نہیں، مجھے نہیں چاہیے۔''

''آپ اسے کھا سکتی ہیں۔''

''میں نہیں کھانا چاہتی۔ اسے کھا کر میری ٹانگوں اور بازوؤں پر بال نکل آئیں گے۔''

اس پر دریا کی سطح اور کناروں سے قہقہے بلند ہوئے۔ ظاہر ہے، مسز اوئیشی بھی، جو کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھیں، خوب زور زور سے ہنسیں۔ ورنہ ابھی ذرا دیر پہلے تک وہ باہر دریا پر جو کچھ ہو رہا تھا اُسے دیکھتے ہوئے بے حد اداسی محسوس کر رہی تھیں۔ راس کے بچے دریا میں اور کنارے پر غیر شعوری طور پر ایک ٹولی کی صورت میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ مسز اوئیشی کو ماتسوائے ان بچوں میں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اُس کا چہرہ رہ رہ کر ان کے ذہن میں اُبھرتا تھا۔

اپنی امّی کی موت کے بعد سے ماتسوئے کلاس میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ تیسری صف میں، کھڑکی کے پاس، اس کی کرسی دو مہینے سے خالی پڑی تھی۔ اس کی امّی کے انتقال کے ایک مہینے بعد مسز اوئیشی اس کے گھر گئی تھیں۔ انھیں اس کی وہ باتیں یاد آئی تھیں جو اس نے اسکول کے پہلے دن ان سے کی تھیں، اور وہ اس کے لیے کنول کے پھول کی تصویر والا کھانے کا ڈبا تحفے میں لے گئی تھیں۔ اس کے ابّا، بڑھئی کا واموتو، بھی اُس روز اتفاق سے گھر پر تھے۔ مرد ہوتے ہوئے بھی انھیں یہ کہتے ہوئے رونا آ گیا کہ ان کے لیے اپنی بیٹی کو اسکول بھیجنا اور بچی کو سنبھالنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی بات اتنی درست تھی کہ مسز اوئیشی جواب میں کچھ نہ کہہ سکیں اور خاموشی سے ماتسوئے کو دیکھتی رہیں۔ ماتسوئے، اپنی ننھی بہن کو پیٹھ پر باندھے، چپ چاپ اپنے ابّا کے پاس بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی لگتی تھیں اور چہرے پر ایک خالی پن کا تاثر تھا، جیسے اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ استانی نے کھانے کا ڈبا اس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا: ''ماتچان، یہ وہ ڈبا ہے جو تم لینا چاہتی تھیں۔ جب کبھی اسکول آ سکو تو اسے ساتھ لے آنا۔''

ماتسوئے نے خالی پن سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے امید ہے تم جلد ہی اسکول آ سکو گی،'' مسز اوئیشی اپنے لفظوں پر خود ہی حیران رہ گئیں، کیوں کہ ان کی بات کا یہی مطلب نکل سکتا تھا کہ انھیں امید ہے کہ ننھی بچی زیادہ دن زندہ نہیں رہے گی۔ ان کا چہرہ اس احساس پر سرخ ہو گیا، لیکن ماتسوئے یا اس

کے ابّا کے چہروں کا تاثر تبدیل نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح شکر گزاری کے انداز سے اس کی بات سنتے رہے۔

کچھ دن بعد مسز اوئیشی کو ننھی بچی کی موت کی اطلاع ملی، اور انھیں ماتسوئے کی جانب سے سکون کا سا احساس ہوا۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی اسکول نہیں آئی۔ انھوں نے ماسونو اور کوتوئے سے اس کے بارے میں پوچھا لیکن کوئی تسلّی بخش اطلاع نہ مل سکی۔ آخر انھوں نے ماتسوئے کو خط لکھا۔ یہ دس دن پہلے کی بات تھی۔

''پیاری ماتسوئے،

مجھے تمھاری ننھی بہن کے انتقال کے خبر سن کر نہایت افسوس ہوا۔ لیکن اب اس کے لیے کچھ کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اب ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اپنے دل میں اس کی یاد کو محفوظ رکھیں۔ تمھیں اس صدمے سے اب نکل آنا چاہیے۔ تم اسکول آنا کب سے شروع کر رہی ہو؟ میں روز تمھارے بارے میں سوچتی ہوں اور تمھاری خالی کرسی کو دیکھتی رہتی ہوں۔

ماتچان، تم جلدی ہمارے پاس واپس آ جاؤ اور دوبارہ پڑھائی شروع کر دو۔''

مسز اوئیشی نے یہ خط کوتوئے کے ہاتھ بھجوایا جو ماتسوئے کے گھر کے بالکل پاس رہتی تھی۔ لیکن انھیں احساس تھا کہ اس خط میں وہ ماتسوئے سے وہ کچھ کرنے کو کہہ رہی ہیں جو اس کے لیے ناممکن ہے۔ ننھی بچی کے مرنے کے بعد بھی ماتسوئے سے چھوٹا ایک بھائی اور ایک بہن موجود تھے۔ اگرچہ ماتسوئے ابھی پانچویں کلاس میں پہنچی تھی اور ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بچی ہی تھی۔ لیکن گھر داری کی تمام ذمے داری اس پر آ پڑی تھی۔ یہ کام اسے کتنا بھی ناپسند کیوں نہ ہو، اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ اپنے ابّا کو کام پر بھیجنے سے پہلے ماتسوئے کو برتن دھونا اور کھانا پکانا ہوتا تھا۔ مسز اوئیشی نے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کا تصور کیا جو چوزوں کی طرح ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے اپنے ابّا کے گھر واپس آنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ قانون کہتا تھا کہ ان بچوں کو اسکول میں داخل کرانا لازمی ہے، لیکن اسے نافذ کرنے کا کوئی عملی طریقہ موجود نہیں تھا۔

مسز اوئیشی کا خط لے جانے کے اگلے دن کوتوئے نے آتے ہی انھیں اطلاع دی: ''استانی صاحبہ، جب میں کل آپ کا خط لے کر ماتسوئے کے پاس گئی تو وہاں ایک عورت تھی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا: ماتچان گھر پر ہے؟ تو وہ

کہنے لگی: نہیں ہے۔ تو مجھے وہ خط اسی کو دینا پڑا کہ ماتچان کو دے دے۔''

''اچھا۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔ کیا ماتچان کے ابّا گھر پر تھے؟''

''پتا نہیں۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔ اس عورت کے منہ پر پوڈر لگا ہوا تھا اور اس نے بہت خوب صورت کیمونو پہن رکھا تھا۔ کوتسورو کہہ رہی تھی کہ شاید وہ ماتچان کی نئی امی ہو۔'' کوتوئے یہ کہتے ہوئے شرما گئی۔

''اگر ایسا ہے تو ماتچان پھر سے اسکول آنے لگے گی،'' استانی بولی۔

اس کے بعد دس دن سے زیادہ گزر گئے لیکن ماتسوئے اسکول نہ آئی۔ اس وقت، کھڑکی میں سے بچوں کو کیکڑے پکڑنے میں مشغول دیکھتے ہوئے مسز اویشی بے چینی سے یہ سوچ رہی تھیں کہ ان کا خط ماتسوئے تک پہنچا بھی ہوگا یا نہیں۔

تاداشی بند کو پھلانگ کر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا آیا، اس کے ہاتھ میں ایک ڈبا تھا جس میں اس کے پکڑے ہوئے تین کیکڑے بند تھے۔ گرمیاں آنے کو تھیں اور زمین کے خالی مستطیل قطعے میں لگا خوبانی کا پیڑ، اپنے گھنے سبز پتوں سمیت، بند پر گہرا سایہ ڈال رہا تھا۔ پیڑ کے نیچے کھڑی راس کے گاؤں کی لڑکیوں نے کیکڑے کے شکاری کا خیر مقدم کیا اور ان میں سے ہر ایک دوسروں سے پہلے اس سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''تانکو، ایک کیکڑا مجھے دے دو۔ دے دو گے نا؟''

''مجھے بھی دینا۔''

''مجھے بھی؟''

''وعدہ؟''

لڑکیاں چار تھیں اور کیکڑے تین۔ تاداشی بند کے اوپر چڑھ کر کھڑا ہو گیا اور سوچ میں گم رہا۔

''تم انھیں کھاؤ گی یا نہیں؟'' اس نے باری باری ہر لڑکی کو دیکھا۔ وہ یہ کیکڑے ان لڑکیوں کو دینا چاہتا تھا جو انھیں کھائیں۔ سب سے پہلے کوتسورو بولی: ''ہاں ہاں، کیوں نہیں کھاؤں گی۔ چاندنی راتوں کے بعد کیکڑے بہت مزے دار لگتے ہیں۔''

تاداشی مسکرانے لگا۔ ''نہیں، جھوٹی! اندھیری راتوں کے بعد مزے دار لگتے ہیں۔''

''جھوٹے تم ہو! چاندنی راتوں کے بعد مزے دار لگتے ہیں۔''

MashalBooks.com

''میں نے تو آج تک نہیں سنا۔تم نہیں جانتیں کہ چاندنی راتوں میں کیکڑے کمزور ہو جاتے ہیں اور مزے کے نہیں رہتے؟'' تاداشی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

مگر کوتسورو اپنی بات پر ڈٹی رہی اور اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی: ''میں نے تو آج تک نہیں سنا۔تم نہیں جانتے چاندنی راتوں کے بعد کیکڑے مزے دار ہو جاتے ہیں؟ چلو میں خود کھا کر دیکھوں گی۔سارے مجھے دے دو۔''

''نہیں، دریا کے کیکڑے کھانے سے کیا پتا چلے گا۔سمندر کے کیکڑے کھا کر دیکھو۔''

اس بحث نے لڑکیوں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔

''استانی صاحبہ، آپ بتایئے، چاندنی راتوں میں مزے دارے ہو جاتے ہیں یا اندھیری راتوں میں؟''

''چاندنی راتوں میں، ہے نا؟''

ماسونو، کوتسورو اور میسا کو، تینوں نے ایک ساتھ کھڑکی میں کھڑی استانی سے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے، اندھیری راتوں میں۔''

لڑکوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔''دیکھا! ہم نے کیا کہا تھا؟''

''مگر میں ٹھیک سے نہیں جانتی۔ممکن ہے چاندنی راتوں میں ہوتا ہو،'' استانی بولیں۔اس بار وہ مسکرا رہی تھیں۔

لڑکیاں بازو اوپر اٹھا کر اچھلنے لگیں۔ظاہر ہے، ان میں سے کوئی بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا۔وہ صرف شور مچا مچا کر خوش ہو رہے تھے۔صرف تاداشی ایسا تھا جس نے سنجیدگی سے استانی کی طرف دیکھا اور بولا: ''پاگل!''

لڑکیوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔

''تم نے استانی کو ایسی بات کہی؟''

''افوہ! استانی صاحبہ کو پاگل کہہ رہا ہے!''

تاداشی اپنا سر کھجانے لگا۔مگر جب شور تھما تو وہ اسی سنجیدگی سے مسز اوئیشی سے کہنے لگا: ''مگر میں بتاتا ہوں۔کیکڑے احمق ہوتے ہیں اور چاندنی میں اپنے سایوں کو بھوت سمجھنے لگتے ہیں۔اس سے وہ خوف کے مارے دُبلے ہو جاتے ہیں۔اندھیری راتوں

MashalBooks.com

میں سائے نہیں ہوتے، اس لیے کیکڑوں کو ڈر بھی نہیں لگتا اور وہ خوب موٹے ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اگر وہ چاندنی رات میں جال میں آ جائیں تو ہم انھیں چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ دُبلے ہوتے ہیں اور مزے دار نہیں لگتے۔ پھر ہم اندھیری رات کا انتظار کرتے ہیں تاکہ وہ موٹے اور مزے دار ہو جائیں۔ استانی صاحبہ، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو انھیں کھا کر دیکھ لیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم سب انھیں کھا کر دیکھیں گے،'' مسز اوئیشی نے مذاق کے لہجے میں جواب دیا، جس پر بحث ختم ہوگئی۔

دو دن بعد تاداشی سچ مچ سمندری کیکڑے لے آیا جنھیں چاندنی راتوں میں پکڑا گیا تھا۔ جب حساب کا پہلا پیریڈ شروع ہوا تو اس نے اپنی تونبے کی شکل کی ٹوکری مسز اوئیشی کی طرف بڑھائی۔

''استانی صاحبہ، یہ رہے کیکڑے۔ چاندنی راتوں والے، دبلے اور بے مزہ۔''

انھیں اسی دن صبح پکڑا گیا تھا اور وہ ابھی زندہ تھے۔ وہ ٹوکری میں پرے سرسرا رہے تھے۔ سب بچے ہنسنے لگے۔

''ارے تانکو، تم واقعی لے آئے؟'' استانی مسکرائیں اور ہچکچاتے ہوئے ٹوکری لے لی۔ کیکڑے ٹوکری کی اندر کی سطح پر رینگ رہے تھے اور ان کے سرسرانے کی آواز آ رہی تھی جیسے وہ اپنی تقدیر سے لڑ رہے ہوں۔ دونوں کیکڑوں کا ایک ایک بڑا پنجہ کسی طرح ٹوٹ گیا تھا اور وہ بڑی مصیبت میں لگ رہے تھے۔ وہ دوسرا پنجہ اوپر اٹھائے ہوئے تھے کہ اگر کوئی ان پر حملہ کرے تو اپنا بچاؤ کر سکیں۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

''بے چارے، تم چاہتے ہو میں انھیں کھا جاؤں؟''

''ہاں، آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

''چھوڑ دیتے ہیں بے چاروں کو۔''

''نہیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اب اسے پورا کیجیے۔''

تاداشی نے چاروں طرف دیکھا اور دوسروں سے تائید چاہتے ہوئے بولا:

''ٹھیک ہے نا؟'' لڑکوں نے جوش میں آ کر تالیاں بجائیں۔

''چلو پھر ایسا کرتے ہیں، چپڑاسی سے کہیں گے کہ انھیں اُبال دے تاکہ ہم سائنس کی کلاس میں ان کا معائنہ کر سکیں۔ ٹھیک ہے؟ اور پھر سب لوگ گھر سے کیکڑے کے

MashalBooks.com

موضوع پر مضمون لکھ کر لائیں۔ کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے!''

''ٹھیک ہے!''

کلاس کے سب بچوں نے اپنی بھرپور رضا مندی کا اظہار کیا۔ ٹوکری کو کھڑکی کے پاس ایک کیل سے لٹکا دیا گیا۔ پورے پیریڈ کے دوران کیکڑے مسلسل سرسراتے رہے، اور ان کی سرسراہٹ سن کر بچے ہنستے رہے۔

پیریڈ ختم ہوا تو مسز اوئیشی نے ٹوکری کو کیل پر سے اتارا اور اسے لے کر چپڑاسی کے کمرے کی طرف چلیں۔ کوتسورو اور کوتوئے ان کے پیچھے پیچھے آئیں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

''استانی صاحبہ،'' وہ دونوں بولیں۔ جب وہ ان کی بات سننے کو مڑیں تو دونوں نے ایک ساتھ کہا: ''ماتچان.....''

''ماتچان؟''

''وہ کل رات کشتی میں بیٹھ کر اوساکا چلی گئی۔''

''نہیں!'' استانی یہ خبر سن کر سکتے میں کھڑی رہی گئیں۔ کوتوئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی: ''اسے اس کے رشتے داروں نے گود لے لیا ہے۔''

''واقعی؟''

''اور اس کے ابّا اور چھوٹا بھائی دونوں یہیں رہ گئے۔''

''اچھا۔ کیا ماتچان خوش تھی؟''

کوتوئے نے خاموشی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس بار کوتسورو بولی: ''ماتچان کہہ رہی تھی، میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔ وہ دروازے سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس کے ابّا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ پہلے انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ دروازے سے چمٹی رہی۔ پھر وہ اسے سر پر اور پیٹھ پر زور زور سے مارنے لگے۔ ماتچان چلّا رہی تھی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر دکان والی بڑی بی نے اسے بڑی مشکل سے سمجھا کر جانے پر راضی کیا۔ اور ماتچان چلی گئی۔ سب کو اس پر افسوس ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ سب رو رہے تھے۔ میں بھی رو رہی تھی۔ میں سب کے ساتھ دور تک اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ ماتچان نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کیوں، ٹھیک ہے نا، کوتوئے؟

MashalBooks.com

اور.....'' یہاں تک پہنچ کر وہ حیران ہو کر رک گئی، کیوں کہ مسز اوئیشی نے اچانک سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا تھا اور آنکھوں پر رومال رکھ لیا تھا۔ اتنی دیر میں سانائے اور ماسونو بھی وہاں پہنچ چکی تھیں، اور سب لڑکیاں غمگین ہو کر استانی کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا سر ایک طرف کو جھک گیا تھا، آنکھیں رومال سے ڈھکی ہوئی تھیں اور کیکڑوں کی ٹوکری ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ ان سب کی آنکھوں میں بھی ہم دردی کے آنسو بھر آئے۔

اس دن کے بعد سے تیسری صف میں کھڑکی کے پاس والی کرسی، ماتسوئے کی کرسی، کچھ عرصے تک خالی رہنے لگی۔ ایک دن مسز اوئیشی کو اُس کرسی پر خاموش بیٹھے دیکھا گیا جس پر ماتسوئے صرف ایک دن آ کر بیٹھی تھی۔ کچھ دنوں بعد کرسیوں کی ترتیب بدل گئی تو یہ کرسی ایک لڑکے کو مل گئی۔ اب کوئی ماتسوئے کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا۔ اور اس نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ ماتسوئے کو بھول گئے ہیں، پانچویں کلاس کی اس لڑکی کو جو خدا حافظ کہے بغیر چلی گئی۔

یہ مارچ کے شروع کا ایک دن تھا، اُس وقت سے کچھ پہلے جب بچے ترقی پا کر چھٹی کلاس میں جانے والے تھے۔ بہار کا آغاز بس ہونے ہی کو تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ اس روز برف پڑ رہی تھی۔ مس اوئیشی کی وہ بس نکل گئی جس میں وہ ہر روز اسکول جایا کرتی تھیں۔ انھیں اگلی بس لینی پڑی۔ وہ بس اسٹاپ پر اتر کر اپنی چھتری کھولے بغیر دوڑتی ہوئی اسکول پہنچیں اور تیزی سے اسٹاف روم میں داخل ہو گئیں۔ پھر کمرے کے ماحول نے انھیں اپنے قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے سر گھما کر کمرے میں بیٹھے پندرہ استادوں اور استانیوں کو دیکھا اور سوچ میں پڑ گئیں کہ کس سے بات کریں۔ سب لوگ سخت فکر اور تناؤ کی حالت میں لگ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟'' انھوں نے اپنی ساتھی استانی مس تامورا سے پوچھا۔ مس تامورا نے گویا انھیں خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اپنے ٹھوڑی کی حرکت سے پیچھے پرنسپل صاحب کے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولیں: ''کاتاوکا صاحب کو پولیس والوں کے پاس لے جایا گیا ہے۔''

''اوہ، نہیں!''

مس تامورا نے پھر سر ہلا کر مسز اوئیشی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''اندر بیٹھے ہیں۔'' مس تامورا نے پرنسپل صاحب کے کمرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے دبی

ہوئی آواز میں بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک کا تا اوکا کی ڈیسک کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ان سب میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ سب کے سب خاموش، انگیٹھی کے گرد بیٹھے تھے۔ جب اسکول کی گھنٹی بجی تو وہ سب سکون کا سانس لیتے ہوئے باہر نکل آئے۔ مسز اوئیشی مس تامورا کے ساتھ ہال میں چلی آئیں اور بے صبری سے پوچھنے لگیں:

''معاملہ کیا ہے؟''

''کہہ رہے ہیں کہ وہ سُرخے ہیں۔''

''سُرخے؟ کیوں؟''

''میں نہیں جانتی کیوں۔''

''کیا وہ سُرخے ہیں؟ مگر کیسے؟''

''مجھے کیا پتا؟ مجھ سے مت پوچھو۔''

وہ دونوں چلتے چلتے مسز اوئیشی کی کلاس تک پہنچ گئی تھیں اور مسکرا کر ایک دوسرے سے رخصت ہوئیں، اگرچہ دونوں کو احساس تھا کہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ بچوں کو بظاہر کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے، لیکن آج وہ غیر معمولی طور پر پُر جوش لگ رہے تھے، شاید برف باری کی وجہ سے۔ مسز اوئیشی نے پڑھائی پر توجہ دینے کی کوشش کی، لیکن پچھلے پانچ سال میں، جب سے انھوں نے پڑھانا شروع کیا تھا، پیریڈ انھیں کبھی اتنا طویل معلوم نہیں ہوا تھا جتنا آج لگ رہا تھا۔ جب وہ پیریڈ پورا ہونے پر اسٹاف روم میں واپس پہنچیں تو انھوں نے استادوں کو پُرسکون پایا۔

''پولیس والے چلے گئے،'' ایک نوجوان کنوارے استاد نے، جو ٹیچرز کالج سے فارغ التحصیل تھا، مسکراتے ہوئے بتایا۔ پھر وہ کہنے لگا: ''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مخلص ہونے سے کبھی فائدہ نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' مسز اوئیشی نے پوچھا۔ ''آپ کو استادوں کی طرح بات کرنی چاہیے۔'' کسی نے انھیں ٹہوکا دے کر چپ کرا دیا۔ یہ مس تامورا تھیں۔

وائس پرنسپل کمرے میں داخل ہوئے اور صورتِ حال کی وضاحت کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ مسٹر کا تا اوکا کو صرف پوچھ گچھ کے لے جایا گیا ہے، اور اب جبکہ پرنسپل صاحب انھیں لینے گئے ہیں تو وہ جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ ان کے کہنے کے مطابق اصل آدمی مسٹر کا تا اوکا نہیں بلکہ پاس کے قصبے کے ایک پرائمری اسکول کے مسٹر اینا گاوا نامی

استاد ہیں، جو اپنی کلاس کے بچوں کو امن پسندی کا سبق دیتے رہے ہیں۔ مسٹر کاتا اوکا سے صرف اس لیے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے کہ وہ ٹیچرز کالج میں اینا گاوا کے ساتھ پڑھ چکے ہیں، لیکن انھیں بَری کر دیا گیا ہے، یعنی حکام کو ان کے خلاف کوئی شہادت دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ ''شہادت'' سے حکام کی مراد ''گھاس کے بیج'' نامی مجموعہ ہے جو مسٹر اینا گاوا کی کلاس کے بچوں کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ پولیس کو اس مجموعے کا کوئی نُسخہ مسٹر کاتا اوکا کے گھر یا اسکول میں ان کی ڈیسک کی درازوں میں نہیں ملا۔

''مگر کیوں؟ میں یہ مجموعہ دیکھ چکی ہوں۔ اسے سُرخ کس طرح کہا جا سکتا ہے؟'' مسز اوئیشی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

وائس پرنسپل کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ''اسی لیے تو کہتے ہے کہ مخلص ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر پولیس آپ کی یہ بات سن لے تو آپ کو بھی سُرخ قرار دے دے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ پتا ہے، مجھے اس مجموعے کی کچھ تحریریں اتنی پسند آئی تھیں کہ میں نے اپنی کلاس میں بھی پڑھ کر سنائیں۔ گیہوں کی کٹائی، اور چٹنی بنانے والی فیکٹری کی چمنی، یہ والی بہت اچھی نہیں۔''

''احتیاط! احتیاط! کیا یہ پمفلٹ آپ کو مسٹر اینا گاوا سے ملا تھا؟''

''نہیں، میں نے تو اس کی وہ کاپی پڑھی تھی جو اسکول کو بھیجی گئی تھی۔''

وائس پرنسپل نے گھبرا کر پوچھا: ''اب کہاں ہے وہ؟''

''میرے کمرے میں۔''

''اسے فوراً لے آیئے، جلدی!''

پمفلٹ کی کاپی کو فوراً انگیٹھی پر رکھ کر نذرِ آتش کیا گیا جیسے اس میں طاعون یا کسی اَور مہلک بیماری کے جراثیم موجود ہوں۔ بھورا دھواں اٹھ کر چھت تک پہنچا اور ایک کھڑکی میں سے جو تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی، باہر نکل گیا۔

''اوہ! شاید مجھے اس کو جلانے کے بجائے پولیس کے سپرد کرنا چاہیے تھا۔ لیکن پھر وہ مسز اوئیشی کو لے جاتے۔ بہرحال، ہمیں وفادار اور محبِ وطن شہری بن کر رہنا چاہیے،'' وائس پرنسپل نے کہا۔ مسز اوئیشی کی نظریں دھویں کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہ بولیں، جیسے انھوں نے کچھ نہ سنا ہو۔

MashalBooks.com

اگلے دن کے اخباروں میں مسٹر اینا گاوا کے معاملے کی خبریں سنسنی خیز سُرخیوں میں چھپیں جن میں کہا گیا تھا: ''سُرخ استاد نے معصوم ذہنوں کو آلودہ کر دیا۔'' مقامی لوگ سکتے میں آ گئے جیسے ان کے سر پر ہتھوڑے کا وار ہوا ہو۔ مسٹر اینا گاوا کو، جو اپنے شاگردوں میں بے حد مقبول تھے، اچانک دھکیل کر غدار کے مقام پر پہنچا دیا گیا۔

''کیسی ہولناک بات ہے! ہم سب کو اب بالکل قدامت پرست بن کر رہنا پڑے گا،'' سیکنڈ ہیڈ ٹیچر، جو ایک معمر آدمی تھے، بولے۔ دوسرے استادوں نے اپنی رائے یا احساس کا بالکل اظہار نہیں کیا۔ مسز اوئیشی اخبار کے مبالغہ آمیز مضمون کی چند سطریں بار بار پڑھتی رہیں۔ ان سطروں میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح مسٹر اینا گاوا کی کلاس کا ہر بچہ اپنے گھر سے ایک ایک انڈا لے کر آیا اور ان سب نے جلوس کی صورت میں پولیس اسٹیشن تک جا کر مطالبہ کیا کہ انھیں یہ انڈے مسٹر اینا گاوا کو دینے کی اجازت دی جائے جو سرد حوالات میں بند تھے۔

مسٹر کاتاوکا جب آج اسکول پہنچے تو سب نے انھیں اپنے سوالوں سے گھیر لیا جیسے وہ اچانک ہیرو بن گئے ہوں۔ ''کیا محسوس ہوا؟'' کسی نے پوچھا۔ مسٹر کاتاوکا نے اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے، جو ایک ہی دن میں پچک سے گئے تھے اور بڑے ہوئے شیو کے ساتھ سیاہی مائل نیلے دکھائی دے رہے تھے، جواب دیا: ''بہت خوفناک! اب میں سوچتا تو مجھے وہ سب کچھ حماقت معلوم ہوتا ہے، لیکن اس وقت تو انھوں نے مجھے تقریباً سُرخا قرار ہی دے دیا تھا۔ کہنے لگے: اینا گاوا نے بتایا ہے کہ تم چار پانچ دفعہ ان کی میٹنگوں میں شریک ہو چکے ہو۔ یہ بھی کہا کہ تم نے تاکیجی کو بایاشی کی تحریریں تو ضرور پڑھی ہوں گی۔ میں نے کہا کہ میں نے تو یہ نام بھی کبھی نہیں سنا۔ کہنے لگے: حرام زادے! تم نے اس کا نام ابھی پچھلے دنوں اخباروں میں تو ضرور پڑھا ہوگا۔ اس پر مجھے یاد آیا۔ آپ لوگوں کو یاد ہے، وہ جو ایک ناول نگار تھا جو کچھ عرصہ پہلے قید خانے میں مر گیا تھا؟'' (اصل بات یہ تھی کہ اسے تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا، مگر اخباروں میں یہی چھپا کہ وہ قید خانے میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔)

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ وہ سُرخ ناول نگار تھا،'' نوجوان کنوارے استاد نے جواب دیا۔

''پولیس کو اینا گاوا کے پاس سے اس کی بہت سی کتابیں ملیں جو پرولتاریہ یا ایسی

ہی کسی چیز کے بارے میں تھیں۔ وہ کالج کے دنوں سے کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا،'' مسٹر کاتا اوکا نے کہا۔

اس دن جاپانی زبان کے پیریڈ میں مسز اوئیشی نے کچھ کہنے کی کوشش کی، کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ اس کے شاگردوں کو مسٹر اینا گاوا کی خبر مل چکی ہو گی جنھوں نے ''گھاس کے بیج'' نامی مجموعہ مرتب کیا تھا۔

''تم لوگوں میں سے کس کس کے گھر پر اخبار آتا ہے؟'' انھوں نے سوال کیا۔

بیالیس بچوں کی کلاس میں تقریباً ایک تہائی نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

''تم میں سے کون کون اخبار پڑھتا ہے؟''

صرف دو یا تین بچوں نے ہاتھ بلند کیے۔

''کسی کو پتا ہے کہ سُرخے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ ایک مبہم سے علم کے تاثر کے ساتھ، جس کی وضاحت ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

''کسی کو پتا ہے کہ پرولتاریہ کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

کسی کو پتا نہیں تھا۔

''اور سرمایہ دار کا؟''

''مجھے پتا ہے۔'' ایک ہاتھ بلند ہوا۔ پوچھے جانے پر شاگرد کا جواب تھا: ''امیر لوگوں کو کہتے ہیں۔''

''ہوں.....ٹھیک ہے۔ اچھا، تو پھر مزدور کسے کہتے ہیں؟''

''مجھے معلوم ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

کلاس کے اکثر بچوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ واحد سوال تھا جس کا جواب وہ سب اپنے تجربے کی بنا پر اعتماد کے ساتھ دے سکتے تھے۔ اس اعتبار سے مسز اوئیشی بھی ان سے مختلف نہ تھیں۔ اگر ان کا کوئی شاگرد ان سے یہی سوالات کرتا تو انھیں کہنا پڑتا: ''مجھے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔'' بہرحال، پانچویں کلاس کے بچوں سے یہ سب کچھ سمجھنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس کے فوراً بعد مسز اوئیشی کو ہدایت کی گئی کہ کلاس میں اس قسم کی باتیں نہ کیا

کریں۔ ضرور کسی نے اس بے ضرر سی گفتگو کی اطلاع پرنسپل تک پہنچا دی تھی، کیوں کہ انھوں نے مسز اوئیشی کو خود بلا کر تنبیہ کی۔ ''احتیاط کرو،'' انھوں نے کہا۔ ''آج کل ہمیں بہت سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکالنی چاہیے۔''

اس کے سوا پرنسپل نے کوئی اَور اقدام نہیں کیا، کیوں کہ غالباً وہ اپنے مرحوم دوست کی بیٹی کو عزیز رکھتے تھے۔ لیکن ''گھاس کے بیج'' والے معاملے کے بعد، جو مسز اوئیشی کو بے ضرر کتاب معلوم ہوتی تھی، اس واقعے کے بعد وہ بجھ کر رہ گئیں، حالاں کہ وہ خاصی خوش مزاج سمجھی جاتی تھیں۔ یہ بے دلی نہ صرف باقی رہی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس عرصے میں مسز اوئیشی کی کلاس کے بچے چھٹی کلاس میں پہنچ گئے۔ اس سال موسمِ خزاں میں، حالات کو دیکھتے ہوئے، یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں اِیزے کے بجائے، جہاں چھٹی کلاس کے بچوں کو ہمیشہ لے جایا جاتا تھا، کومپیرا کی سیر پر بھیجا جائے جو مقابلتاً نزدیک واقع تھا۔ اس کے باوجود بہت سے بچے ایسے تھے جو مشکلات کے باعث اس سیر میں شامل نہ ہو سکتے تھے۔ دیہات کے لوگ جتنے محنتی تھے اُتنے ہی کفایت شعار بھی تھے۔ کچھ بچوں کے والدین نے بعد میں اس شرط پر منظوری دی کہ بچے راتوں کو سرائے میں نہیں ٹھہریں گے اور تین دن کا کھانا اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس کے باوجود، چھٹی کلاس کے دونوں سیکشن ملا کر بھی، صرف ساٹھ فیصد بچے اس پروگرام میں شامل ہوئے۔ راس کے گاؤں والے بچے بالکل آخری وقت میں فیصلہ کر سکے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور پھر مسز اوئیشی کو اطلاع دی۔

''استانی صاحبہ، سونکی نہیں جا سکے گا کیوں کہ وہ رات کو سوتے میں بستر گیلا کر دیتا ہے،'' ماسونو نے بتایا۔

''مگر تم لوگ جانتے ہو کہ ہم رات کو سرائے میں نہیں رکا کریں گے۔ صبح کی کشتی سے جا کر شام کی کشتی سے لوٹ آیا کریں گے۔''

''لیکن کشتی تو صبح چار بجے چلتی ہے۔ کیا کشتی میں نیند نہیں آئے گی؟''

''شاید۔ ویسے تو صرف دو گھنٹے کا سفر ہے، اور تم لوگوں کو شاید جوش کے مارے نیند نہ آئے۔ مگر تم کیوں نہیں چل رہیں، ماسونو؟''

MashalBooks.com

''مجھے سردی لگ جائیگی۔''

''کیسی نازک بچی ہو تم!''

''لیکن میرے امّی ابّا مجھے سیر کی رقم سے دُگنے پیسے جمع کر کے دیں گے۔''

''اچھا؟ لیکن یہ پیسے تو وہ تمھارے لیے کبھی بعد میں بھی جمع کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟ میرا خیال ہے تمھیں ان سے کہنا چاہیے کہ تمھیں اس پر ضرور بھیجیں۔''

''مگر مجھے حادثے سے ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں؟ اگر ہم سردی لگنے یا حادثہ ہونے سے ڈرتے رہیں تو کوئی بھی سیر پر نہ جا سکے۔''

''کسی کو بھی نہیں جانا چاہیے، کسی کو بھی نہیں!''

''افوہ بھئی، تمھیں سمجھانا تو ناممکن ہے۔'' مسز اوئیشی نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

''مسز اوئیشی، میں اپنے ابّا کی کشتی میں بیٹھ کر تین بار کومپیرا جا چکا ہوں۔'' اس لیے میں تو اس دفعہ نہیں جاؤں گا،'' تاداشی بولا۔

''نہیں چلو گے؟ مگر تم پہلے کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ تو نہیں گئے، کیوں؟ تمھارے ابّا ماہی گیروں کے سردار ہیں، اس لیے تم ہر سال وہاں جا سکتے ہو۔ لیکن یہ خاص موقع ہے تاداشی، اس لیے تمھیں ضرور ہم لوگوں کے ساتھ چلنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ والی سیر تمھیں ہمیشہ یاد آیا کرے گی۔''

کوتسورو بھی نہیں جا رہی تھی، اور فوجیکو بھی نہیں۔ کوتسورو نے بتایا: ''استانی صاحبہ، فوجیکو کے گھر والوں پر بہت قرضہ ہے، اس لیے وہ سیر پر نہیں جا سکتی۔ اس کا مکان بڑا ہے، لیکن گروی رکھا ہوا ہے، اور بہت جلد ان سے چھن جائے گا۔ ان کے پاس گھر میں بیچنے کے لیے ایک بھی چیز نہیں بچی ہے۔''

''ایسی باتیں مت کرو،'' مس اوئیشی نے کوتسورو کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ کوتسورو نے زبان نکال کر ان کا منہ چڑا دیا۔

''شریر لڑکی!'' یہ کہتے ہوئے مسز اوئیشی کو اچانک فوجیکو کا مکان یاد آیا۔ جن دنوں انھوں نے راس کے گاؤں میں نئی نئی ملازمت کی تھی، انھیں معلوم ہوا تھا کہ یہ مکان کسی بھی دن قرض خواہوں کے سپرد کیا جانے والا ہے۔ انھیں اس مکان کا توشہ خانہ یاد

آیا جس کی شمالی دیوار کا پلستر بالکل جھڑ چکا تھا۔ فوجیکو، جو ایک قدیم گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، بڑی پُرسکون اور خاموش طبع بچی تھی..... اس کی یہ خصوصیات اس کے اعلیٰ حسبِ نسب کی علامت تھیں۔ وہ بہت کم روتی یا مسکراتی تھی۔ جب کبھی مثلاً کوتسورو اس کے بارے میں کوئی غلط سلط بات کرتی تو وہ بڑے سرد انداز میں اسے گھور کر دیکھتی، جس کا حوصلہ کوئی اور بچہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی عرفیت ''سڑی ہوئی ملکہ'' تھی، جس کا پسِ منظر ایک کہاوت تھی جو اس کے ابّا کو بہت پسند تھی: بریم مچھلیوں کی ملکہ ہے، چاہے سڑی ہوئی ہو۔ لیکن وہ اس طرح پکارے جانے پر بھی برہم نہ ہوتی تھی۔

اس کے برعکس کوتسورو صاف گو اور کھلے ذہن کی بچی تھی۔ وہ دوسروں کی برائی کرنے میں ذرا تکلّف نہ کرتی، نہ دوسروں کی تنقید کا کچھ خاص برا مانتی۔ اس کے سب گھر والے محنت سے کام کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ وہ سب کے سب دیانت دار اور صاف گو تھے۔

کوتسورو کی بھی ایک عرفیت تھی: ''پھٹی ہوئی بھوں والی''، کیوں کہ ایک بار اس کی ایک بھوں پر آبلہ پڑ گیا تھا جس کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ عام بچوں، خصوصاً لڑکیوں، کو اکثر اس طرح پکارا جاتا تو وہ رو دیتیں، لیکن کوتسورو ایسی نہ تھی۔ وہ قطعی جھینپے بغیر جواب دیتی جیسے کسی اَور کا ذکر ہو رہا ہو: ''یہ نام ایسے مت لو۔ یہ بہت خاص آنکھ ہے، اور کسی کو آسانی سے نصیب نہیں ہوتی۔'' شاید یہ دلیل اس نے اپنے والدین سے سیکھی تھی۔

اس بار بھی اس نے استانی کو صاف بتا دیا تھا کہ وہ کیوں سیر میں شامل نہیں ہو سکتی۔ ''میرے ابّا نے پچھلے دنوں اِمداد باہمی کی انجمن سے قرضہ لے کر ایک بڑی کشتی خریدی ہے۔ اس لیے ہم آج کل خرچ میں احتیاط کر رہے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کومپیرا اس وقت جاؤں گی جب خود پیسے کمانے لگوں گی۔''

وہ اس قسم کی لڑکی تھی کہ ہر کسی کے معاملے میں دخل دیتی اور منع کرنے کے باوجود دوسروں کے بارے میں تبصرے کرنے سے باز نہ آتی۔ مثلاً وہ کہتی کہ میسا کو اس لیے سیر پر نہیں جا رہی کہ اس کے ماں باپ کنجوس ہیں اور کوتوئے اور سانائے کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے اتنے سارے بھائی بہن ہیں۔

مگر سیر شروع ہونے سے دو دن پہلے شامل ہونے والوں کی تعداد اچانک بڑھ گئی، اور اب ماسونو کو چھوڑ کر اس کے گاؤں کے تمام بچے جانے کو تیار ہو گئے۔

MashalBooks.com

حالات میں یہ اچانک تبدیلی تب پیدا ہوئی جب خاموش طبع کیچی جی نے اپنی بچائی ہوئی رقم نکالی جو جنگلوں میں کام کر کے کمائی تھی، اور اس رقم سے سیر کا خرچ ادا کیا۔ ایسو کیچی نے بھی فوراً اس کی تقلید کی۔ اس نے بھی وہ پیسے بچا رکھے تھے جو کیچی اور تلی ہوئی ''دہی پھلیاں'' گھر گھر بیچنے پر اسے کمیشن کے طور پر ملے تھے۔ جب ایسو کیچی جا رہا تھا تو بھلا تاداشی اور تاکے ایچی کیوں کر پیچھے رہتے۔ تاداشی کو اپنی اس بچت کا خیال آیا جو جال کھینچنے کے معاوضے میں سے جمع کی گئی تھی، تاکے ایچی نے کہا کہ وہ ان پیسوں کو استعمال کر سکتا ہے جو انڈے بیچنے سے اسے حاصل ہوئے تھے۔ وہ ایسے کفایت شعار گاؤں کے رہنے والے تھے کہ اب سے پہلے انھیں ایسے کسی مقصد کے لیے اپنی بچت کو استعمال کرنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ تاداشی کے والدین نے اسے سمجھایا بھی کہ ایسا نہ کرے، مگر وہ نہ مانا اور تاکے ایچی کو ساتھ لے کر خود ڈاک خانے جا پہنچا۔

جب سارے لڑکوں نے جانے کا فیصلہ کر لیا تو لڑکیوں کو بھی سوچنا پڑا۔ میسا کو نے، جس کے گھر والے سب سے کم مشکل حالات میں تھے، فوجیکو کو ساتھ چلنے کی دعوت دے دی، کیوں کہ ان دونوں کی ماؤں کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔ سیپی کا بنا ہوا ایک قلم دان، فوجیکو کے علم میں آئے بغیر، اس کے گھر سے میسا کو کے گھر منتقل ہو گیا۔ اس طرح فوجیکو کے سیر پر جانے کا انتظام ہو گیا۔ جب کوتسورو کو ان دونوں کے جانے کے ارادے کا علم ہوا تو وہ فوراً بے تاب ہو گئی اور گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

''جب میسا کو اور فوجیکو جا رہی ہیں تو پھر میں بھی ضرور جاؤں گی۔'' کوتسورو اپنی ضد پر اَڑ گئی اور پیر پٹخ پٹخ کر وہ رونا مچایا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سوج کر اَور چھوٹی ہو گئیں۔ اس کی امّی اپنی آنکھیں بھی اس کی طرح سکیڑ کر ہنسنے لگیں۔ انھوں نے کوتسورو کے سامنے جو تجویز رکھی وہ خاصی دشوار تھی۔ ''دیکھو، میسا کو کے گھر والے خوش حال ہیں، اور فوجیکو کے ابّا بہر حال اونچے گھرانے کے ہیں۔ ہم ان کی نقل نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر کوتوئے جائے گی تو ہم تمھیں بھی بھیج دیں گے۔ جاؤ اس سے جا کر پوچھو۔'' انھوں نے یہ اس لیے کہا تھا کہ ان کے خیال میں کوتوئے کے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن کوتسورو بھاگی بھاگی واپس آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''کوتوئے جا رہی ہے!'' اس نے ہانپتے ہوئے اعلان کیا۔

''اچھا؟ سچ مچ؟''

''بالکل، اس کی امّی بھی وہیں تھیں اور انھوں نے خود بتایا۔''

یہ بات اتنی سیدھی لگی کہ کوتسورو کی امّی کو یقین نہ آیا اور وہ خود اس کی تصدیق کرنے گئیں۔ انھیں شک تھا کہ کوتسورو اتنی تیز ہے کہ اس نے کوتوئے کے گھر والوں کو کسی طرح رام کرلیا ہوگا۔

''کوتسورو نے تو آپ لوگوں کو مجبور نہیں کیا؟'' انھوں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

کوتوئے کی امّی، جو کسی ماہی گیر کی طرح دھوپ سے سنولائی ہوئی تھیں، مسکرا اٹھیں اور ان کے دانت نظر آنے لگے۔ ''ایسا موقع زندگی میں ایک آدھ بار ہی ملتا ہے۔ بچوں کو بھیج ہی دینا چاہیے۔ کوتوئے کو اتنی محنت کرنی پڑتی ہے، بچوں کو سنبھالنا اور دوسرے کام۔''

''کوتسورو کا بھی یہی ہے۔ لیکن آپ کوتوئے کو پہننے کے لیے کیا دیں گی؟''

''سوچ رہی ہوں اسے ملاّ حوں والا بلاؤز دلوادوں۔''

''وہ تو بہت مہنگا آتا ہے، ہے نا؟''

''خیر، اس موقعے پر یہ نہیں سوچنا چاہیے۔ آپ بھی کوتسورو کو یہی دلوادیں۔ بعد میں اس کی چھوٹی بہن کے کام آجائے گا۔''

''ہوں۔''

''سانائے کی امّی بھی اسے یہی بلاؤز دلوا رہی ہیں۔ آپ بھی سوچ لیں۔''

''ہاں، دیکھتی ہوں۔ سانائے بھی؟ اب میری سمجھ میں آیا کہ کوتسورو اتنی بے تاب کیوں ہو رہی ہے جانے کے لیے۔ اف خدایا! اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

تو یہ سب کچھ اس طرح پیش آیا۔ لیکن آخری وقت پر سانائے نے اپنی درخواست واپس لے لی اور وجہ یہ بتائی کہ ''سردی لگ گئی ہے۔'' مگر دراصل نہ تو اس کے گلے میں خراش تھی اور نہ ناک بہہ رہی تھی۔ اصل خرابی پیسوں کی تھی۔ اس کی امّی اپنا نقاشی اور مونگے کے سرے والا ہیئر پن اپنی بیٹی کے واسطے بیچنے گئیں، مگر وہ اس قیمت پر بکا نہیں جس پر وہ بیچنا چاہتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سانائے کو بلاؤز خرید کر نہ دے سکیں۔ انھوں نے پرانی چیزیں خریدنے والے کو بہت کوسا۔ کہنے لگیں کہ وہ ان کی مجبوری سے

فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔مگر سانائے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے نرمی سے کام لیا۔
''تم کیمونو پہن کر چلی جاؤ۔''
سانائے روہانسی ہوگئی۔
''میں تمھاری بڑی بہن کا کیمونو موڑ کر چھوٹا کر دوں؟''اس کی امّی نے دوبارہ پوچھا۔سانائے کچھ نہ بولی۔
''اگر باقی سب لڑکیاں بلاؤز پہن کر جا رہی ہیں اور تم اکیلی کیمونو پہنو گی تو پھر بہتر ہے کہ مت جاؤ۔یا تو سیر پر جا سکتی ہو یا بلاؤز لے سکتی ہو۔بولو،کیا چاہیے؟''
سانائے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور ہونٹ بند ہونے کے باوجود لرزنے لگے۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دونوں میں سے کس چیز کا انتخاب کرے۔مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کی امّی خود بھی رو پڑنے کے قریب ہیں تو اس نے فیصلہ کر لیا۔''میں نہیں جاؤں گی،''اس نے کہا۔

تریسٹھ بچوں کا گروپ،جن میں سے کوئی بھی ان تمام حالات سے واقف نہیں تھا،کومپیرا کے سفر پر روانہ ہوا۔دو استاد اور دو استانیاں،جن میں ظاہر ہے مسز اوئیشی بھی شامل تھیں،ان کے ساتھ تھے۔چار بجے صبح کشتی پر سوار ہونے کے بعد ان میں سے کسی نے سونے کی کوشش نہ کی۔شور وغل کے درمیان کچھ بچے گیت گاتے رہے:''کشتی میں کومپیرا کی سیر۔''
اِس دوران مسز اوئیشی تنہا بیٹھی خیالوں میں گم رہیں۔سانائے کا خیال ان کے ذہن سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔
کیا اُسے واقعی سردی لگ گئی ہے؟وہ یہی سوچ رہی تھیں۔
سانائے کے علاوہ دس سے زیادہ بچّے اور بھی تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے اس سیر میں شامل نہیں ہوئے تھے۔مگر مسز اوئیشی کے خاص طور پر سانائے کے بارے میں فکرمند ہونے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نہ جانے والوں میں وہ واحد بچی تھی جو راس کے گاؤں کی رہنے والی تھی۔(ماسونو کو اب راس کے گاؤں والی نہیں کہا جا سکتا تھا کیوں کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ قصبے میں منتقل ہو چکی تھی۔)جب مسز اوئیشی نے تصور کیا کہ آج سانائے اکیلی راس کی سڑک پر چلتی ہوئی اسکول کی طرف جا رہی ہوگی تو انھیں افسوس ہونے لگا کہ انھوں

نے آج کلاس کو معطل کیوں نہ کر دیا۔ انھیں باقی بچوں کا بھی رہ رہ کر خیال آ رہا تھا جو آج اپنے ساتھیوں کے بغیر کلاس میں بیٹھے پڑھ رہے ہوں گے۔

تو دوتسو پہنچ کر انھوں نے پہلی ٹرین لی اور کومپیرا پہنچ کر سب سے پہلے وہاں کے مندر میں حاضری دی۔ مندر کی اونچی پتھریلی سیڑھیوں پر چڑھتے اور پسینا پسینا ہوتے ہوئے کچھ بچے ایک بار پھر ''کشتی میں کومپیرا کی سیر'' والا گیت گانے لگے۔ ان کے برعکس مسز اوئیشی پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ اس کپکپاہٹ نے ان پر بار بار حملہ کیا..... یا شیما جانے والی ٹرین پر بھی، اور وہاں کی کیبل کار میں سوار ہونے پر بھی۔ وہ خود کو بے حد بیمار محسوس کرنے لگیں جیسے ان کے گھٹنوں پر ٹھنڈا پانی ڈالا جا رہا ہو۔ وہ اس خوش گوار کیفیت سے محروم تھیں جو ارد گرد پھیلے ہوئے موسمِ خزاں کے خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری تھی۔ وہ صرف آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سوونیر کی دکان میں گئیں اور تصویری کارڈوں کے کئی سیٹ خریدے۔ یہ اُن بچوں کے لیے تھے جو اس سیر میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔

پھر وہ سب یاشیما سے روانہ ہو کر تاکاماتسو پہنچے جو ان کی سیر کا آخری مقام تھا۔ جب انھوں نے اپنی سیر کے دوران آخری دوپہر کا کھانا شاہ بلوط کے باغ میں بیٹھ کر کھایا، تو مسز اوئیشی سے بہت کم کھایا گیا اور انھوں نے اپنا باقی کھانا بچوں میں بانٹ دیا۔ انھیں احساس ہوا کہ ان پر اس کھانے کا بھی بھاری بوجھ تھا جو اس کو بانٹ دینے سے ہٹ گیا ہے اور انھیں کچھ سکون ملا ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت وہ تاکاماتسو کی سڑکوں پر سب کے ساتھ پیدل چلتی ہوئی بندرگاہ کی طرف گئیں؛ انھیں گھر واپس لوٹنے اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ جانے کی شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی۔ مس تامورا نے ان سے کہا: ''آپ کا چہرہ زرد ہو رہا ہے مسز اوئیشی۔'' ان کی اس بات سے مسز اوئیشی کی کیفیت اَور خراب ہو گئی اور انھیں زیادہ سردی لگنے لگی۔

''پتا نہیں مجھے اتنی تھکن کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ ٹھنڈ بھی بہت لگ رہی ہے۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے کوئی دوا لی؟''

''میں نے کچھ سکون آور گولیاں لی ہیں جنھیں ٹھنڈا کرنے والی گولیاں کہا جاتا ہے۔'' مسز اوئیشی نے اس نام پر ذرا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مگر شاید مجھے اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کے بجائے نُوڈل یا کوئی اَور چیز کھانی چاہیے۔''

MashalBooks.com

''ہاں، بالکل ٹھیک۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔''

لیکن ان کے آگے اور پیچھے بچے چل رہے تھے، اس لیے دونوں استانیوں نے ان بچوں کے بندرگاہ کے ہال میں پہنچ جانے کا انتظار کیا۔ تب انھوں نے مرد استادوں کو اطلاع دی اور ایک ایک کر کے خاموشی سے باہر نکل آئیں۔ وہ سڑک پر سے جلدی سے ایک گلی میں مڑ گئیں تاکہ بچے انھیں دیکھ نہ لیں۔ گلی میں دونوں طرف سوونیر کی دکانیں اور ریستوراں تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں داخل ہونے کا نیچا دروازہ تھا جس میں بڑی سی لالٹین لٹک رہی تھی۔ لالٹین پر ''نوڈل''، ''سُوشی''، ''ساکے''، ''مچھلی اور جھینگے'' جیسے قسم قسم کے کھانوں کے نام موٹے حرفوں میں درج تھے۔ جب وہ ایک ریستوراں کے پاس سے گزریں جس کی نیچی چھت موسم کی مناسبت سے میپل کے پتّوں سے مزیّن تھی، تو مس تامورا نے پوچھا: ''مسز اوئیشی، کیا آپ نے کسی نوڈل ریستوراں کے بارے میں سنا ہے جہاں سردی سے بچنے کی دوا ملتی ہو؟ کیوں نہ اسے آزما کر دیکھیں؟''

مسز اوئیشی کے منہ سے ''ہاں'' نکلنے ہی والا تھا کہ وہ اچانک ایک نوجوان لڑکی کی زندہ دل اور تیز آواز سے چونک پڑیں جو ''ایک تامپورا، ایک تامپورا!'' کی آوازیں لگا رہی تھی۔ یہ ایسی دل خراش آواز تھی کہ حیرت سے اُن کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ آواز ریستوراں کے اندر سے آئی تھی۔ ریستوراں کے دروازے پر ڈوری سے کھینچا جانے والا پردہ لٹکا ہوا تھا جو اس علاقے میں شاذونادر ہی دکھائی دیتا تھا۔ مسز اوئیشی نے بے اختیار پردہ ہٹا کر اندر جھانکا تو انھیں ایک لڑکی نظر آئی جس کے بال ''مومووارے'' انداز میں بنے ہوئے تھے۔ بالوں میں اُس نے میپل کا ایک مصنوعی پتّا بہت نقش ونگار والی مگر سستی سی پن کی مدد سے اُڑس رکھا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ ایپرن کی جیبوں میں ڈالے بڑی معصومیت سے باہر گلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مس اوئیشی کی آنکھیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ لڑکی نے دونوں استانیوں کو ریستوراں کے گاہک سمجھ کر اُسی تیز آواز میں ''شام بخیر'' کہا۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی سدھی ہوئی صدا معلوم ہوتی تھی جو اپنے کام کی عادی ہو چکی ہو۔ اس کے روایتی جاپانی وضع کے بنے ہوئے بال اور کیمونو پہننے کے بالغانہ انداز نے اسے بہت مختلف بنا دیا تھا، لیکن اس کی لمبی پلکیں مسز اوئیشی کی پہنچان کو دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔

''ماتسوئے! تم ماتچان ہو نا؟''

لڑکی کی ریستوراں میں داخل ہوتی ہوئی گاہک عورت کی جانب سے خود کو

مخاطب کیے جانے پر اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ سانس روک کر ایک قدم پیچھے کو ہٹ گئی۔

''تم تو اوسا کا چلی گئیں تھیں، نہیں؟ کیا تم جب سے یہیں ہو ماتچان؟''

جب مسز اوئیشی نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو ماتسوئے نے سسکیاں لینی شروع کر دیں جیسے اسے آخر کار سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ مسز اوئیشی نے بے اختیار ہو کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور ڈوری والے پردے سے باہر لے جانے ہی کو تھیں کہ ریستوراں کی مالکہ لکڑی کی کھڑاویں پہنے پچھلے دروازے سے نمودار ہوئی۔

''کون ہیں آپ؟ مجھ سے پوچھے بغیر اسے باہر کیوں لے جا رہی ہیں؟'' اس نے شک بھری آواز میں سوال کیا۔ تب ماتسوئے کو بولنا ہی پڑا۔ اس نے اس عورت کے شک کو دور کرنے کی غرض سے سرگوشی میں کہا: ''امی، یہ مسز اوئیشی ہیں۔''

استانیوں کو نوڈل کھانے کی بالکل فرصت نہ ملی۔

MashalBooks.com

روانگی

اس سفر کے بعد سے مسز اوئیشی کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ وہ بیماری کی وجہ سے کوئی بیس روز تک اسکول نہ جا سکی تھیں کہ ایک صبح، اسکول کی تیسری ٹرم شروع ہونے کے چند دن بعد، انھیں ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ اس پر لکھا تھا:

پیاری مسز اوئیشی،

آپ کا کیا حال ہے؟ میں ہر صبح اسمبلی کے وقت آپ کے بارے میں سوچتی ہوں اور فکر مند رہتی ہوں۔ کوتسوروا اور فوجیکو کہتی ہیں کہ آپ کے بغیر ان کا پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔ لڑکے بھی یہی کہتے ہیں۔ خدا کرے آپ جلد صحت یاب ہو جائیں اور دوبارہ اسکول آنے لگیں۔ راس کے گاؤں والے تمام بچے آپ کے بارے میں فکر مند ہیں۔

خدا حافظ

سانائے

یہ خط راسکے بچوں کے حقیقی احساسات کو ظاہر کرتا تھا۔ پہلے تو اسے پڑھ کر مسز اوئیشی کی آنکھوں میں غیر متوقع طور پر آنسو آ گئے: لیکن آخری لفظ پڑھ کر وہ بے اختیار ہنسنے لگیں۔

''دیکھیے، امّاں۔ آج کل لوگ خط کے آخر میں خدا حافظ لکھنے لگے ہیں،'' انھوں نے پوسٹ کارڈ اپنی امّاں کو دکھاتے ہوئے کہا جو ناشتا لے کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔

''یہ بچی تو بڑی خوش خط ہے۔ چھٹی میں پڑھتی ہے؟''

''ہاں، اپنی کلاس میں سب سے ذہین ہے۔ میرا خیال ہے بڑی ہو کر ٹیچرز اسکول میں جائے گی، مگر ذرا خاموش طبع ہے۔ پتا نہیں اچھی استانی بن سکے گی یا نہیں، مسز اوئیشی بڑے جذبے سے سانائے کے بارے میں بات کرنے میں جو کبھی اپنے جذبے کا

MashalBooks.com

بلند آواز میں اظہار نہیں کرتی تھی۔

''مگر تم خود بھی تو چھٹی ساتویں کلاس تک ایسی ہی خاموش اور شرمیلی تھیں۔ اب تو تم کتنی بدل گئی ہو! آج کل تو تم خوب باتونی ہو رہی ہو۔''

''اچھا؟ کیا میں واقعی بہت بولنے لگی ہوں؟''

''ہاں۔ بولنے سے گھبرانے والی استانی کیسے ہو سکتی ہے!''

''یہ تو سچ ہے۔ اسی لیے تو مجھے فکر ہے کہ سانائے کلاس کے سامنے بول سکے گی یا نہیں۔''

''تم اپنے ہی کو لے لو۔ تم سے تو کسی کے سامنے گیت بھی نہیں گایا جاتا تھا، یاد ہے؟ مگر اب تم اچھی خاصی استانی بن گئی ہو۔''

''مگر اب جو میرا گانے کو اتنا دل کرتا ہے، شاید یہ بھی بچپن کے شرمیلے پن کا ردِ عمل ہو۔''

''شاید تم اکلوتی ہونے کی وجہ سے شرمیلی تھیں۔ کیا یہ لڑکی بھی اکلوتی ہے؟''

''نہیں نہیں، اس کے تو پانچ بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن میں نے سنا ہے ریڈ کراس کی نرس ہے۔ ایک بار سانائے نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ وہ بڑی ہو کر استانی بننا چاہتی ہے۔ جب میں اس سے سوال کرتی ہوں تو عموماً جواب نہیں دے پاتی۔ لیکن مضمون لکھتے وقت بالکل بڑوں جیسی لگتی ہے۔ اُس مضمون میں اس نے لکھا تھا: آئندہ سے عورتوں کو ملازمت کرنی چاہیے، ورنہ وہ میری امّی کی طرح مصیبت اٹھاتی رہیں گی۔ معلوم ہوتا ہے اس کی امّی کو بڑی مشکلات سے گزرنا پڑا ہے۔''

''یہ لڑکی تو بالکل تم جیسی لگتی ہے۔''

''میں نے تو بچپن ہی سے سب کو بتانا شروع کر دیا تھا کہ میں استانی بنوں گی۔ لیکن سانائے تو ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتی۔ اکثر تو وہ دوسروں کے پیچھے چھپتی رہتی ہے، مگر لکھتی بہت اچھا ہے۔''

''ہر قسم کے بچے ہوتے ہیں۔ مگر اس کے کارڈ کو دیکھ کر تو مجھے نہیں لگتا کہ وہ بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی ہوگی۔''

''ہاں، شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اور یہ خدا حافظ پر خط کو ختم کرنا، کیسی مزے دار بات ہے!''

سانائے کا پوسٹ کارڈ پڑھنے اور امّاں سے اُس کے بارے میں اتنی بات چیت کرنے کے بعد مسز اوئیشی ہشاش بشاش ہوگئیں اور انھوں نے اپنے معمول سے کچھ زیادہ کھایا۔ کھانے کے بعد انھوں نے پھر کارڈ پر نظر ڈالی جیسے آئینہ دیکھ رہی ہوں، اور شاگردوں کے چہرے ایک ایک کر کے ان کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔

سب سے پہلے انھیں ماتسوئے کا خیال آیا کہ اس کی زندگی کیسے بسر ہو رہی ہوگی، اس لڑکی جو روایتی جاپانی انداز کے بال بنائے، تیز آواز میں ''ایک تامپورا!'' کی صدائیں لگایا کرتی تھی۔ مسز اوئیشی کو بندرگاہ کے پاس والے ریستوراں کا نام یاد آیا: ''شیمایا''۔ انھوں نے سفر سے لوٹ کر ماتسوئے کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ مگر اس کا جواب نہ آیا۔ ممکن ہے ماتسوئے کو خط لکھنا نہ آتا ہو، کیوں کہ اس نے صرف چوتھی کلاس تک تعلیم پوری کی تھی۔ یا شاید اُسے یہ خط ملا ہی نہ ہو۔

اُس شام جب وہ تاکاماتسو میں تھیں، ریستوراں کی مالکہ کے رویّے سے پہلے پہل شک جھلکتا تھا، مگر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کون ہیں تو اس نے بڑی مہمان نوازی کا برتاؤ کیا۔

''اچھا اچھا! مجھے بہت خوشی ہوئی آپ کے آنے کی۔ تشریف رکھیے۔''

وہ استانیوں کو اندر لے گئی اور انھیں چٹائی والی پتلی بنچوں پر بیٹھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے کشن دیے۔ مگر صرف ریستوراں کی مالکہ ہی بات چیت کرتی رہی، ماتسوئے خاموش کھڑی رہی۔ جب مسز اوئیشی نے اپنے چند شاگرد لڑکوں کو ریستوراں کے سامنے جمع ہوتے اور ڈوری والے پردے سے جھانکتے دیکھا تو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں تم سے دوبارہ ملوں گی۔ میرا خیال ہے ہماری کشتی آنے والی ہے۔'' مسز اوئیشی نے خدا حافظ کہا، لیکن ماتسوئے انھیں چھوڑنے دروازے تک نہ آئی۔ شاید اُسے اس کی اجازت نہ ہو۔ مسز اوئیشی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے دانستہ گریز کرتے ہوئے، تیز تیز قدموں سے چلنے لگیں۔ ان کے پیچھے آتے ہوئے شاگردوں نے اپنے اپنے انداز میں ان سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔

''وہ لڑکی کون تھی مسز اوئیشی؟''

''کیا یہ لوگ آپ کے رشتے دار ہیں؟''

MashalBooks.com

ان لڑکوں میں سے کوئی بھی راس کے گاؤں کا رہنے والا نہ تھا، اور غالباً اسی لیے کوئی بھی ماتسوئے کو نہیں پہچان سکا تھا جو بڑے اسکول میں صرف پہلے دن آئی تھی۔ مسز اوئیشی کو ماتسوئے کے خیال سے اپنی حاضر دماغی پر اطمینان ہوا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ پردے سے باہر نہیں لائی تھیں۔

آج بھی مسز اوئیشی ماتسوئے کا تصوّر کرب کے احساس کے بغیر نہیں کر پاتی تھیں۔ ان کے تمام شاگرد ایک ہی سال پیدا ہوئے تھے، ایک ہی مقام پر پلے بڑھے تھے، اور ایک ہی اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن اتنے گتھے ہوئے گروہ میں بھی مختلف بچوں کے مختلف حالات سے اتنی خلیجیں حائل ہوگئی تھیں۔ ماتسوئے کو، جو اپنی ماں کے مرنے کے بعد ایک اجنبی، ناقابلِ فہم ماحول میں جا پڑی تھی، مستقبل میں کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ اس کے دوست جنھوں نے اس کے ساتھ ساتھ زندگی شروع کی تھی، اب اپنے اپنے حالات کے مطابق خود کو اپنے مستقبل کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جب مسز اوئیشی نے انھیں یہ لکھنے کو کہا کہ وہ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں، تو سانائے نے لکھا تھا: ''مدرّس''۔ اس نے کسی عام شاگرد کی طرح ''استاذ'' یا ''استانی'' کے بجائے یہ خاص لفظ استعمال کیا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ محض اس کا خواب نہیں بلکہ باقاعدہ عزم ہے۔ اب چھٹی کلاس میں پہنچ کر، یہ بچے اپنی پوری صلاحیت سے اپنے فرشتوں والے پر آزما کر اُڑنا سیکھ رہے تھے۔

ماسونو کا ارادہ سب سے منفرد تھا۔ ایک بار اسکول میں گیت گانے کی محفل میں اس نے ''قلعے کے کھنڈر پر چمکتا چاند'' والا گیت گایا تھا جسے پورے اسکول نے بہت سراہا۔ اسے جب بھی موقع ملتا وہ گانے لگتی، اور اس کی گانے کی صلاحیت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ گانے کے معاملے میں اس کا ذہن بہت عمدگی سے کام کرتا تھا، اور وہ لکھی ہوئی موسیقی کو پڑھتے ہوئے خود ہی گانے لگتی تھی، جو دیہی علاقوں سے آنے والے بچوں کے لیے خاصی دشوار بات تھی۔

میسا کو سے بھی ہائی اسکول تک پہنچنے کی توقع کی جاتی تھی۔ وہ پڑھائی میں کافی پیچھے تھی اور دل شکستہ سی معلوم ہوتی تھی، کیوں کہ اسے اسکول کی پڑھائی کے بعد ہائی اسکول میں داخلے کے امتحان کی الگ سے تیاری کرنی پڑتی تھی۔ اس میں حساب کے بنیادی اصول سمجھنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا اور اسے ہائی اسکول کے بجائے سِلائی کے اسکول میں جانے کی خواہش تھی جہاں داخلے کا

MashalBooks.com

امتحان نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی امّی یہ بات سننے کو تیار نہیں تھیں، لہذا اس بچی کی دل شکستگی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی امّی اسے ہر قیمت پر ضلعے کے ہائی اسکول میں بھیجنا چاہتی تھیں، اور اکثر اس کے اسکول آتی رہتی تھیں۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ان کے اپنے جوش و خروش کے اظہار سے بچی میں بھی جذبہ پیدا ہوگا۔ مگر میسا کو ان سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ ایک بار اس نے کہا تھا: ''ہندسوں کو دیکھتے ہی میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں امتحان میں کیسے بیٹھوں گی؟ میں آپ کو بتا رہی ہوں، جب امتحان کا دن آئے گا تو میں بیمار پڑ جاؤں گی۔'' اسے حساب میں کمزور ہونے کی وجہ سے امتحان میں ناکامی کا اندیشہ تھا۔

اس معاملے میں کوتوئے اس کی عین ضد تھی۔ اگرچہ گھر پر اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا پھر بھی اس میں ہندسوں کو سمجھنے کی ویسی ہی غیر معمولی صلاحیت تھی جیسی ماسونو میں گانے کی صلاحیت تھی۔ اسے حساب میں ہمیشہ پورے نمبر ملتے تھے۔ دوسرے مضامین میں بھی وہ سانائے سے کچھ ہی کم نمبر لیتی تھی۔ وہ بغیر کسی مشکل کے ہائی اسکول میں داخل ہو سکتی تھی، مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ چھٹی کلاس کے آگے نہیں پڑھے گی۔ خواہ وہ اپنی تقدیر پر قانع ہو یا نہ ہو، دوسرے بچوں سے اسے کوئی رشک محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار مسز اوئیشی نے اس سے پوچھا تھا: ''کیا تمھارا اس سال کے بعد پڑھائی چھوڑنے کا پکّا ارادہ ہے؟''

کوتوئے نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

''مگر تمھیں اسکول پسند تو ہے، ہے نا؟''

کوتوئے نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر کم سے کم ایک سال تو اَور پڑھو۔''

بچی خاموش رہی اور سر جھکا لیا۔

''کیا میں تمھارے والدین سے بات کروں؟''

اس پر کوتوئے پہلی مرتبہ بولی۔ ''مگر اب تو سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے،'' اس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیسا وعدہ؟ کس نے وعدہ کر لیا ہے؟''

''امی سے۔ انھوں نے اسی شرط پر مجھے سیر پر جانے کی اجازت دی تھی کہ میں یہ سال پورا کر کے اسکول چھوڑ دوں۔''

MashalBooks.com

''کتنی افسوس ناک بات ہے! اگر مَیں تم سے کہوں تب بھی تم اپنا وعدہ نہیں توڑو گی؟''

کوتوئے نے نفی میں سر ہلا کر دھیمی آواز میں کہا: ''نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' پھر اس نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ پیدا کی جس سے اس کے دانت دکھائی دینے لگے۔ ''میری چھوٹی بہن توشی اگلے سال بڑے اسکول میں آنے والی ہے۔ اگر میں بھی آگے پڑھتی رہی تو گھر پر کھانا کون پکائے گا۔ اگلے سال سے مجھے کھانا پکانا شروع کرنا ہے۔''

''اف! توشی تو ابھی صرف چار سال کی ہے، اور ابھی سے کھانا پکاتی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا تمھاری امّی اب بھی ہر روز مچھلی پکڑنے جاتی ہیں؟''

''ہاں، تقریباً ہر روز۔''

مسز اوئیشی کو یاد آیا کہ ایک بار کوتوئے نے ایک مضمون میں لکھا تھا: ''مجھے اپنے لڑکی ہونے پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ میرے ابّا بھی ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ مجھے لڑکا ہونا چاہیے تھا۔ چوں کہ میں لڑکی ہوں اور ان کے ساتھ مچھلی پکڑنے نہیں جا سکتی اس لیے میری امّی کو ان کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ وہ میری جگہ سخت سردی اور سخت گرمی کے دنوں میں کھلے سمندر میں کام کرنے جاتی ہیں۔ بڑے ہو کر میں ان کے لیے وہ سب کچھ کروں گی جو میرے بس میں ہوگا۔''

چلو، قصہ ختم ہوا، مسز اوئیشی نے سوچا۔ کوتوئے اسے اپنا قصور سمجھتی تھی کہ وہ لڑکی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر چیز کے بارے میں اس کا رویّہ بہت محتاط تھا۔ اب یہ پوچھنا بے کار تھا کہ یہ خیال اس کے ذہن میں کس نے ڈالا۔ یہ بچی اپنی قسمت کے لکھے کو تسلیم کر چکی تھی کہ یہ اس کی پڑھائی کا آخری سال ہے۔

''مگر کوتوئے.....'' مسز اوئیشی نے کہنا چاہا کہ اُس کا خیال غلط ہے، مگر رک گئیں پھر انھوں نے یہ کہنا چاہا: ''تم کتنی قابلِ تعریف ہو!'' مگر اس سے بھی گریز کیا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ''مجھے تم سے ہم دردی ہے۔''

''مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا،'' آخر کار انھوں نے کہا۔ یہ ایک مناسب فقرہ تھا جو کوتوئے کو تسلّی دینے اور اس کی ہمت بندھانے کے لیے تھا۔ کوتوئے نے اپنے سامنے

MashalBooks.com

کے، ذرا باہر کو نکلتے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے جواب دیا: ''مگر میں آگے چل کر ضرور کچھ کروں گی۔ دو سال بعد، جب توشی چھٹی کلاس پوری کر لے گی تو امّی مجھے ایک درزن کے پاس سلائی سیکھنے بھیج دیں گی۔ اور جب میں سولہ سال کی ہو جاؤں گی تو اوساکا جا کر کام کروں گی۔ میں اپنی پوری کمائی کیمونو بنوانے پر خرچ کروں گی۔ میں نے امّی سے بھی یہی کیا تھا۔''

''اور پھر تمھاری شادی ہو جائے گی، ہے نا؟''

کوتوئے تھوڑا سا شرما کر مسکرائی۔ لگتا تھا کہ اس نے اپنی تقدیر کو اٹل جان کر خود کو اس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جو کچھ بھی آگے چل کر پیش آنے والا تھا، اسے اس نے انکساری کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ جب وہ اٹھارہ انیس برس کی ہو گی تو اسے اس کے مالک کے گھر سے ایک جھوٹا ٹیلیگرام بھیج کر بلوایا جائے گا کہ ''تمھاری امّی سخت بیمار ہیں۔'' جب وہ گاؤں پہنچے گی تو اس کی امّی اسے کسی محنتی کسان یا ماہی گیر سے بیاہ دیں گی۔

کوتوئے کی امّی کی بھی اسی طرح شادی ہوئی تھی، اور پھر ان کے چھ بچے ہوئے۔ ان میں پانچ لڑکیاں تھیں، اس لیے وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں سہمی رہتی تھیں جیسے اس میں خود انھیں کا قصور ہو۔ ان کے اس رویّے کا اثر کوتوئے پر بھی پڑا تھا اور وہ بھی بہت سہمی سہمی رہتی تھی۔ اس کی امّی ہر روز اپنے شوہر کے ساتھ کام پر جاتی تھیں؛ ان کے چہرے کی رنگت کسی بھی مرد ماہی گیر کی طرح سنولائی ہوئی تھی، اور ان کے بال سمندری ہوا کا سامنا کرتے کرتے بدرنگ اور کھردرے ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنی بیٹی کو اسی راستے پر چلانے پر مصر تھیں جیسے انھیں اپنی زندگی پر کوئی پچھتاوا نہ ہو۔ کوتوئے بھی اسے ایک عام عورت کی فطری زندگی سمجھتی تھی۔ ان دونوں کو، جو حد درجہ محتاط اور قدامت پسند تھیں، کھڑے ہوئے پانی سے تشبیہ دی جا سکتی تھی جس نے بہتے ہوئے شفاف دھارے کو کبھی جانا ہی نہ ہو۔

مسز اوئیشی کو یہ سوچ کر الجھن ہونے لگتی کہ کیا کوتوئے کے گھر جیسے کسی بھی محنتی مگر غریب گھر کو اسی پر مطمئن ہو جانا چاہیے۔ مگر وہ صرف آہ بھر کر افسوس کر سکتی تھیں کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ کوتوئے ہائی اسکول میں چلی بھی جائے تو اس سے اس کے گھر والوں کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

یہ سوچتے ہوئے کہ کسی استاد کا اپنے شاگرد سے بہتر رشتہ کیا ہونا چاہیے، مسز

اوئیشی کو مسٹر اینا گاوا کا خیال آیا، جنھوں نے ''گھاس کے بیج'' نامی مجموعہ مرتب کیا تھا۔ مسٹر اینا گاوا، جنھیں ''غدار'' قرار دے کر قید میں ڈال دیا گیا تھا، کبھی کبھی قید خانے سے اپنے شاگردوں کے نام کاغذ کی پرچیوں پر چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھے ہوئے خط بھیجتے تھے۔ یہ بالکل عام قسم کے خط تھے، جیسے عام لوگ ایک دوسرے کو لکھا کرتے ہیں، لیکن کہا جاتا تھا کہ انھیں کلاس میں پڑھ کر سنانے کی ممانعت تھی۔ ''جو کچھ ہو رہا ہے کیا ایسا ہی ہونا چاہیے؟'' انھوں نے خود سے سوال کیا۔ استادوں کو اپنے شاگردوں سے، کلاس اور منظور شدہ درسی کتابوں کی حد تک، صرف ایک سطحی رشتہ قائم کرنے کی اجازت تھی، اور انھیں احساس رہتا تھا کہ اگر انھوں نے اپنے شاگردوں کو، خود ان کی خواہش کے خلاف، ایک محتاط فاصلے پر نہ رکھا تھا تو وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ غیر شعوری طور پر ہر استاد ایک دوسرے کے رازوں پر آنکھیں اور کان لگائے رکھنے لگا تھا۔

اس کے علاوہ مسز اوئیشی کو غیر متوقع چالوں سے بھی ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ جب انھوں نے اپنے شاگردوں کو اطلاع دی کہ وہ بیماری کی وجہ سے کچھ دن اسکول نہیں آسکیں گی، تو کوتسورو نے بڑے تجسس کے ساتھ پوچھا تھا: ''کیا آپ کو صبح کے وقت متلی ہونے لگی ہے؟''

استانی کا چہرہ بے اختیار سُرخ ہو گیا تھا اور کچھ بچے اس پر قہقہے لگانے لگے تھے۔ انھیں کوتسورو کی بدتمیزی پر غصہ آیا مگر پھر انھوں نے بڑی صاف گوئی سے کہا: ''ہاں، اور مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا اور میرا وزن کافی کم ہو گیا ہے۔ جب میری طبیعت بہتر ہو گی تو میں واپس آجاؤں گی۔''

تب سے وہ اسکول سے غیر حاضر تھیں۔ اب انھیں یاد آیا کہ ان کی بات سن کر سانائے ہی سب سے زیادہ فکر مند دکھائی دی تھی۔ مسز اوئیشی نے چھ سال پہلے کھینچی گئی تصویر نکالی۔ انھوں نے اس کی تیرہ کاپیاں بنوائی تھیں مگر کسی وجہ سے انھیں بچوں میں تقسیم کرنے سے رہ گئی تھیں، اور وہ اب تک البم میں لگنے کے بجائے کاغذ کے لفافے میں رکھی ہوئی تھیں۔ معصوم چہروں والے ان سب بچوں میں کوتسورو سب سے زیادہ بڑی عمر کی دکھائی دیتی تھی، جو تعجب کی بات نہیں تھی۔

کوتسورو کلاس میں سب سے زیادہ لمبے قد کی تھی اور اس وقت باقی بچوں سے دو سال بڑی نظر آتی تھی۔ دوسری بچیاں یا تو اپنے بال چھوٹے کرا لیتی تھیں یا ایک طرف سے

مانگ نکالتی تھیں، لیکن کوتسورو واحد لڑکی تھی جس نے اپنے بال چینی لڑکیوں کے فیشن کے مطابق سامنے ماتھے پر جھکا رکھے تھے اور بڑی لڑکی ہونے کا دانستہ تاثر دیتی تھی۔ ماسونو کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد کوتسورو نے رہنما کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے صبح کے وقت کی متلی والی بات سوجھی تھی۔

راس کے گاؤں والی ایک اَور لڑکی فوجیکو تھی اور صرف وہی ایک تھی جس کے مستقبل کا اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے والدین کی جائیداد آخر کار قرض خواہوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ شاید یہی وجہ ہے، مسز اوئیشی نے سوچا، کہ فوجیکو اب تک اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ہے حالاں کہ اس کی چھٹی کلاس اب پوری ہونے والی ہے۔ انھیں اس لڑکی پر بھی افسوس ہوا جو، کوتوئے کی طرح، بے عملی سے اپنے مستقبل کا انتظار کر رہی تھی۔ فوجیکو دبلی تھی اور اس کا چہرہ زردی مائل اور بے رونق تھا۔ وہ اپنے ہاتھ آستینوں میں چھپائے ہر وقت کپکپاتی معلوم ہوتی تھی اور اس کی سرد، غمگین آنکھوں اور الگ تھلگ رہنے کے رویے میں اس کے وقار کی نہایت کمزور جھلک دکھائی دیتی تھی۔

دوسری طرف کلاس کے لڑکے بے حد زندہ دل اور چونچال تھے۔

''میں ہائی اسکول میں داخلہ لوں گا،'' تاکے اپچی نے فخریہ لہجے میں اعلان کیا تھا۔

تاداشی نے بھی اتنے ہی فخر سے کہا: ''میں یہیں آگے پڑھوں گا۔ یہاں سے پڑھائی پوری کرنے کے بعد بھی ماہی گیری شروع کر دوں گا جب تک مجھے فوج میں بھرتی کے لیے نہ بلا لیا جائے۔ بھرتی ہونے کے بعد فوج میں نان کمیشنڈ آفیسر کے عہدے تک پہنچوں گا۔ میں سارجنٹ بنوں گا، تم لوگ یاد رکھو۔''

''افوہ! نان کمیشنڈ آفیسر!'' مسز اوئیشی نے زور سے کہا، مگر ان کے خیالات کا کسی کو اندازہ نہیں ہوا۔ انھیں عجیب لگ رہا تھا کہ تاداشی، جس نے ایک بار گھر سے زندہ نمونے لاکر چاندنی راتوں اور اندھیری راتوں میں پکڑے جانے والے کیکڑوں کا فرق سمجھانے کی کوشش کی تھی، فوج میں نان کمیشنڈ آفیسر بننے کی خواہش کا اظہار کر رہا ہے۔ لیکن اس کی ایک معقول وجہ تھی۔ اس کے سب سے بڑے بھائی نے فوج کی باقاعدہ نوکری کے دوران تین برس کوریا میں گزارے تھے، اور اس کے بعد اسے فارغ کرنے کے بجائے

منچوریا کی مہم میں حصہ لینے کے لیے محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا تھا۔ حال ہی میں وہ کارپورل بننے کے بعد گھر واپس آیا تھا۔ ننھا تاداشی اس سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی نان کمیشنڈ آفیسر بننے کا ارادہ کر لے تو وہ آسانی سے سارجنٹ کے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ نان کمیشنڈ آفیسروں کو ماہانہ تنخواہ بھی ملتی ہے۔'' تاداشی اپنی زندگی کے طے کردہ راستے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

تاکے ایچی نے اونچی آواز میں جواب دیا: ''میں کیڈٹ بنوں گا۔ تم مجھ سے آگے نہیں نکل سکتے، تانکو۔ میں سیدھا سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر پہنچوں گا۔''

کیچی جی اور ایسو کیچی رشک کی حالت میں لگ رہے تھے۔ تاکے ایچی اور تاداشی کے برخلاف، یہ دونوں ایسے گھروں سے تعلق رکھتے تھے جن کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ دونوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ دونوں اپنے گھر والوں سے جنگ کے موضوع پر کیا باتیں کرتے ہوں گے، مگر اتنی بات یقینی تھی کہ باقی سب لڑکوں کی طرح آخر کار انھیں بھی فوج میں بھرتی ہونا پڑے گا، خواہ ان کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ پچھلے سال (۱۹۳۳) کے موسمِ بہار میں جاپان نے لیگ آف نیشنز کی رکنیت ترک کر دی تھی اور یوں بین الاقوامی برادری سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ لیکن اس کی کیا معنویت تھی اور اس کا ایک قریبی اسکول کے استاد کے قید میں ڈال دیے جانے سے کیا تعلق تھا، ان باتوں کی اِن لڑکوں کو ذرا بھی خبر نہ تھی۔ انھیں تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ انھیں یہ سب باتیں جاننے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس، ملک بھر پر جنگ کا جو ماحول چھا گیا تھا، اس نے ان پر اتنا اثر ڈالا تھا کہ وہ محبِ وطن ہیرو بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

''تمھیں سپاہی بننے کا اتنا شوق کیوں کر ہوا؟'' مسز اوئیشی نے تاداشی سے سوال کیا۔ اس کا جواب صاف تھا: ''کیوں کہ میں کسی جائیداد کا وارث نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے ماہی گیری کے مقابلے میں نان کمیشنڈ آفیسر بننا زیادہ پسند ہے۔''

''ہوں..... اور تمھیں، تاکے ایچی؟''

''میں جائیداد کا وارث ہوں، مگر میں چاول کا کاروبار کرنے کے بجائے فوجی افسر بننا چاہتا ہوں۔''

''اچھا۔ مگر میں سوچتی ہوں..... بہرحال، تم لوگوں کو اس بات پر اچھی طرح غور

کر لینا چاہیے۔'' مسز اوئیشی کو احساس ہوا کہ انھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہیے، اس لیے وہ خاموش ہو کر ان لڑکوں کو دیکھنے لگیں۔

تاداشی، جسے غالباً کسی بات کا احساس سا ہو گیا تھا، پوچھنے لگا: ''کیا آپ کو سپاہی اچھے نہیں لگتے؟''

''نہیں۔ مجھے ماہی گیر اور چاولوں کے تاجر زیادہ پسند ہیں۔''

''مگر کیوں؟''

''تمھیں اتنی کم عمری میں موت کے قریب نہیں جانا چاہیے۔''

''ڈرپوک بلّی!''

''ہاں، وہ تو میں ہوں۔''

وائس پرنسپل نے لڑکوں سے بس اتنی بات کرنے پر جس طرح انھیں تنبیہ کی تھی اس کو یاد کر کے انھیں اب بھی بہت دکھ ہوتا تھا۔ ''مسز اوئیشی،'' وائس پرنسپل نے کہا تھا، ''آپ کو سُرخ کہا جانے لگا ہے۔ ذرا محتاط رہیے۔''

''آخر سُرخ ہوتا کیا ہے؟ مجھے سُرخ کیوں کہا جانے لگا ہے جب کہ میں کمیونزم کے بارے میں ذرا بھی نہیں جانتی؟''

مسز اوئیشی نے، جو اس وقت بستر میں لیٹی بہت ساری چیزوں کے بارے میں سوچ رہی تھیں، اپنی اماں کو آواز دی۔ ''اماں!''

''کیا ہے؟'' اس کی اماں نے سلائیڈنگ دروازے میں سے پکار کر پوچھا۔ وہ کمرے میں نہیں آئیں بلکہ انگیٹھی کے قریب بیٹھی سلائی کے کام میں مصروف رہیں۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ ذرا یہاں آ جایئے۔''

انھیں قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر انھیں انگشتانہ پہنے ہوئے ایک ہاتھ دروازے کو دھکیلتا دکھائی دیا۔

''مجھے پڑھانے سے سخت وحشت ہونے لگی ہے۔ کیا خیال ہے، آنے والے مارچ سے نوکری چھوڑ دوں؟''

''نوکری چھوڑ دوں؟ آخر کیوں؟''

''میں کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول لوں گی یا کچھ اَور کر لوں گی۔ اسکول میں

پڑھانے سے تو بہتر ہی ہوگا۔ مجھے اسکول کی جنونی تعلیم سے وحشت ہونے لگی ہے۔''

''شش! خاموش!''

''آخر آپ نے مجھے استانی کیوں بنا دیا؟''

''کیا تمھارے خیال میں یہ میرا قصور ہے؟ کیا یہ تمھارا اپنا فیصلہ نہیں تھا؟ تم نہیں کہتی تھیں کہ میری جیسی قابلِ رحم زندگی نہیں گزارنا چاہتیں؟ اس عمر میں دوسرے لوگوں کے کیمونو سینا کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔''

''مگر میرے کام سے تو بہتر ہی ہے۔ مجھے دیکھیے۔ میں پہلی کلاس سے جن بچوں کو پڑھا رہی ہوں ان میں آدھے سے زیادہ لڑکے اب سپاہی بننا چاہتے ہیں۔ تو پھر تعلیم دینے کا فائدہ ہی کیا ہوا؟''

''وہ صرف ہوا کے رخ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ تم دکان کھول کر اسے ہونے سے روک لوگی کیا؟''

''اُف! میں اس تمام چکر سے تنگ آ گئی ہوں۔ اور اس سے بھی بدتر بات یہ کہ میں نے ایک جہازی سے شادی کر لی۔ مجھے آپ کی زندگی سے کچھ سبق سیکھنا چاہیے تھا۔ آج کل کی سمندری مشقیں ہی میری آدھی جان نکالنے کو کافی ہیں۔ لیکن اگر سمندر پُرسکون بھی ہو تو جہاز پر گرنے والا ایک بم مجھے بیوہ کر سکتا ہے۔ سوچتی ہوں یہ بات اُنھیں بتا دوں اور ان سے کہوں کہ ابھی وقت ہے، اپنا پیشہ بدل لیں۔ میں کاشتکاری یا کسی اَور کام میں ان کی مدد کر سکتی ہوں۔ بچہ ہونے والا ہے، اور میں اسے اپنی طرح یتیم نہیں دیکھنا چاہتی۔ اگر میں ملازمت چھوڑ دوں تو آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''تم ہر بات کا قصوروار مجھی کو ٹھہرا دیتی ہو، کیوں؟ اپنی شادی کا فیصلہ بھی تو تم نے خود ہی کیا تھا نا؟ میں تو اس پر خوش نہیں تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر تمھیں بھی میرے جیسے حالات سے گزرنا پڑا تو کتنی بری بات ہوگی۔ مگر تمھاری مرضی کے آگے میں چپ ہو رہی، کیوں کہ وہ تمھیں پسند تھا۔ اب ایسی باتیں کرنے سے کیا حاصل؟''

''مجھے وہ جہازی ہونے کی وجہ سے پسند نہیں تھے..... بہرحال، جو بھی ہو، مجھ سے اب پڑھایا نہیں جاتا۔''

''جو جی میں آئے کرو۔ مجھے پتا ہے تمھارے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔''

MashalBooks.com

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔''

مسز اوئیشی کے بولنے کا انداز ان کے اسکول والے انداز سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن ان کے اس اکھڑے ہوئے لہجے کے پیچھے انسانی زندگی سے بے پناہ محبت موجود تھی۔

کچھ دنوں میں ان کی طبیعت اتنی سنبھل گئی کہ انھوں نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ تب اسکول کا نیا سال شروع ہوا اور ان کے الوداع کہنے کا وقت قریب آ گیا۔ ان کے کچھ ساتھیوں کو ان کے جانے کا افسوس تھا، کچھ کو ان پر رشک آ رہا تھا۔ لیکن کسی نے بھی انھیں ان کے فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی، کیوں کہ وہ کسی نہ کسی حد تک نظروں میں آ گئی تھیں اور ان کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ کوئی بھی شخص ان کی کسی قابلِ اعتراض بات کی نشان دہی نہ کر سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے مسز اوئیشی خود بھی ایسی کسی بات سے واقف نہ تھیں۔ شاید ان کے شاگردوں کا ان سے غیر معمولی لگاؤ ہی ناپسندیدہ بات رہی ہو۔

آخری صبح مسز اوئیشی اپنے اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے کھڑی تھیں جن کی تعداد سات سو تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے انکو تکتی رہیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی پڑنے لگی تھیں کہ اچانک ان کی نگاہِ نیتا پر پڑی جو چھٹی کلاس میں نئے آنے والے بچوں میں سب سے پیچھے کھڑا غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ اپنے الوداعی الفاظ ادا نہ کر سکیں جن کی تیاری کر کے آئی تھیں۔ نیتا کی طرف تعظیماً جھک کر، جیسے وہ ان کے تمام شاگردوں کا نمائندہ ہو، مسز اوئیشی پلیٹ فارم سے اتر آئیں۔ عین اس وقت انھیں ساتویں کلاس کے بچوں میں تاداشی، کیچی، جی، کوتسورو اور سانائے کے چہرے دکھائی دیے جو آنکھوں میں آنسو لیے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دوپہر کے وقفے میں وہ ساتویں کلاس کی لڑکیوں کے کلاس روم کی طرف گئیں، جو علیحدہ واقع تھا۔ کوتسورو نے انھیں فوراً دیکھ لیا اور دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچی۔

''آپ کیوں جا رہی ہیں مسز اوئیشی؟'' کوتسورو نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا جو اس کی جانی پہچانی آواز سے بڑی مختلف لگتی تھی۔ ان کے پیچھے کھڑی سانائے کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔

MashalBooks.com

ماسونو جو ہائی اسکول میں جانے کے لیے سب سے زیادہ بے تاب تھی آخر کار اسی اسکول کی ساتویں کلاس میں رہ گئی تھی۔ لیکن آج وہ نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کوتسورو نے اس کی غیر حاضری کی مبالغہ آمیز وضاحت کی۔

''ماسونو کی دادی اور ابّا نے اس کے ہائی اسکول جانے کی اتنی مخالفت کی کہ اسے ہار ماننی پڑی۔ انھوں نے کہا کہ ریستوراں کی مالکہ کی بیٹی میزبان بن جائے، یہاں تک تو ٹھیک ہے، لیکن وہ اسے گلوکار بننے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ وہ بہت روئی، اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا..... اور مسز اوئیشی، ایک اَور بات ہے۔ میسا کو جس اسکول میں گئی ہے وہ ہائی اسکول نہیں ہے۔ وہ بالکل چھوٹا سا اسکول ہے، گرین اسکول نام کا۔ وہاں صرف تیس بچے پڑھتے ہیں اور بس درزی کی دکان سے ذرا بڑا ہوگا۔ اس سے تو وہ اگر ہمارے ساتھ اسی اسکول میں رہتی تو بہتر تھا، آپ کا کیا خیال ہے؟''

مسز اوئیشی ہنسنے لگیں۔ پھر انھوں نے کوتسورو کو تنبیہ کی۔ ''تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے، کوتسورو۔ اچھا اب مجھے ایک بات بتاؤ۔ ماسونو کیوں نہیں آئی؟''

''اسے اتنی شرم آ رہی ہے کہ اس سے آیا نہیں گیا۔''

''اسے جا کر تسلّی دینا اور کہنا کہ شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، کوتسورو اور سانائے؟ اور فوجیکو کیسی ہے؟''

آپ سن کر حیران ہوں گی، مسز اوئیشی۔ ایسی عجیب و غریب کہانی ہے،'' کوتسورو نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش میں بھنویں اچکاتے ہوئے زور سے کہا۔ ''وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہیوگر ضلعے میں چلی گئی۔ بہار کی چھٹیوں میں وہ پانچوں کے پانچوں سارا سامان لے کر میرے ابّا کی کشتی میں بیٹھ کر گئے۔ اور سامان بھی کیا، بس چٹائیاں، لحاف، اور برتن وغیرہ۔ ان کے پاس صرف ایک الماری تھی، اتنی پرانی کہ اس کا رنگ تک اتر گیا تھا۔ باقی بس لکڑی کے چند صندوق۔ فوجیکو کے گھر والوں نے کبھی محنت کا کام نہیں کیا ہے، اس لیے سب لوگ کہہ رہے تے کہ کہیں انھیں بھیک نہ مانگنی پڑ جائے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کہیں فوجیکو کو کسی گیشا گھر کے ہاتھ بیچ نہ دیں.....'' کوتسورو نے یہ بھی بتایا کہ کشتی کا کرایہ فوجیکو کے گھر والوں نے آدھا نقد ادا کیا اور آدھا اس فرنیچر کی شکل میں، جو بکنے سے رہ گیا تھا۔ مسز اوئیشی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ ''کوتسورو، تم بہت باتونی ہوتی جا رہی ہو، ہے نا؟ تم بڑی ہو کر مڈوائف بنو گی نا؟ ایک اچھی مِڈوائف کو

دوسرے لوگوں کے بارے میں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہییں۔ اچھی مِڈ وائف بننا، بنو گی نا؟''

کوتسورو نے اپنی دھٹائی کے باوجود شرمندہ سی ہو کر کندھے اچکائے اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مسکرا کر بولی: ''میں سمجھ گئی۔ شکریہ۔''

''اور سانائے، مجھے امید ہے کہ تم ایک اچھی استانی بنو گی۔ مگر تمھیں ذرا زیادہ بولنا چاہیے۔ بس یہی میری آخری نصیحت ہے۔'' مسز اوئیشی نے سانائے کا کندھا تھپتھپایا اور وہ کچھ بولے بغیر اثبات میں سر ہلا کر مسکرا دی۔

''اگر تمھاری کوتوئے سے ملاقات ہو تو میری دعائیں پہنچا دینا۔ اس سے کہنا اس کے لے میری آخری نصیحت یہ ہے: اپنا خیال رکھنا اور اچھی بیوی بننا۔''

کوتسورو فوراً بولی: ''اور امید ہے آپ ایک اچھی ماں بنیں گی۔ یہ میری آخری نصیحت ہے۔'' اس نے شوخی سے مسز اوئیشی کے کندھوں پر تھپکی دی۔ اب اس کا قد بالکل استانی کے قد کے برابر پہنچنے لگا تھا۔

''شکریہ،'' مسز اوئیشی نے کہا اور زور سے ہنس دیں۔

ساتویں کلاس میں پہنچنے کے بعد لڑکیاں اور لڑکے الگ الگ کمروں میں بیٹھنے لگتے تھے، اس لیے تاداشی اور گاؤں کے دوسرے لڑکے یہاں نہیں تھے۔ مسز اوئیشی کو لڑکوں کی کلاس میں جا کر گاؤں کے لڑکوں کو خاص طور پر الوداع کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی، چناں چہ انھوں نے سیدھے گھر جانے کا ارادہ کیا۔

''تانکو، سونکی اور کچن کو میری دعائیں پہنچا دیں۔ ان سے کہنا کہ جب ان کا جی چاہے تو مجھ سے ملنے ضرور آئیں۔''

''اور ہم لڑکیاں، مسز اوئیشی؟'' کوتسورو نے سوال کیا۔

''تم بھی ضرور آؤ۔ تمھیں تو دعوت دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو اس سے پہلے بھی آ چکی ہو، ہے نا؟ ارے ہاں، اس پر یاد آیا۔'' مسز اوئیشی نے تصویر کی کاپیاں نکالیں اور ہر لڑکی کو ایک ایک کاپی دی۔ کوتسورو خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے مارے جوش کی ناچنے لگی۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت مسز اوئیشی آرام کر رہی تھیں؛ اسکول کی ملازمت

سے آزاد ہونے پر وہ خوش ہونے کے بجائے سخت دل گرفتگی اور تنہائی کا شکار تھیں جیسے کوئی خزانہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہو۔ تب اچانک تاکے ایچی اور ایسوکیچی غیر متوقع طور پر وہاں پہنچ گئے۔ اپنے پیغام کے اس قدر زوداثر ہونے پر حیران ہو کر مسز اوئیشی نے اپنے بے ترتیب بال درست کیے بغیر دونوں لڑکوں کا استقبال کیا۔

''تمھیں دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ اندر آ جاؤ۔''

لڑکے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر تاکے ایچی بولا: ''ہمیں اگلی بس سے واپس جانا ہے۔ وہ دس پندرہ منٹ بعد روانہ ہو جائے گی۔ اندر آنے کا وقت نہیں ہے۔''

''واقعی؟ تم اس سے اگلی بس سے چلے جانا۔''

''وہ تو اندھیرا ہونے کے بعد گاؤں پہنچتی ہے،'' ایسوکیچی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے راستے میں یہ بات طے کر کے آئے ہیں۔

''اچھا، تو پھر ایک سیکنڈ ٹھہرو۔ میں تمھارے ساتھ بس اسٹاپ تک چلتی ہوں۔ راستے میں باتیں کر لیں گے، ٹھیک ہے؟''

جلدی جلدی اپنے بال درست کر کے انھوں نے پوچھا: ''ہائی اسکول کب سے شروع ہو رہا ہے تاکے ایچی؟''

''پرسوں سے۔''

ہاتھ میں نئی ٹوپی تھامے ہوئے تاکے ایچی کے انداز میں ابھی سے ہائی اسکول کے طالبِ علم کی جھلک آ گئی تھی۔ ایسوکیچی کے ہاتھ میں بھی شکار کی ایک نامانوس سی ٹوپی تھی اور وہ انکسار کے ساتھ اپنے دھاری دار، گھر کے بُنے کیمونو کو گھٹنوں کے پاس سے تھامے ہوئے تھا۔

''کل تم اسکول نہیں گئے تھے ایسوکیچی؟''

''نہیں۔ اب میں اسکول نہیں جاؤں گا،'' ایسوکیچی نے جواب دیا۔ وہ اچانک ٹھہر کر تعظیم میں جھک گیا۔ ''آپ نے اتنے سال مجھ سے اتنا مہربانی کا برتاؤ کیا ہے۔ میں آپ کو خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔''

''ارے ابھی نہیں، ابھی تو میں تمھارے ساتھ چل رہی ہوں۔'' مسز اوئیشی مسکرائیں، انھوں نے اپنے آنسو روک لیے اور لڑکوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ بس اسٹاپ تک چھ منٹ پیدل کا راستہ تھا۔ وہ دونوں لڑکوں کے بیچ میں چل رہی تھیں۔ ایسوکیچی

MashalBooks.com

نے اپنی بڑی سی ٹوپی کے نیچے سے، جس سے اس کا سر پورا ڈھک گیا تھا، منہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔

''میں کل اوساکا جا رہا ہوں تا کہ وہاں کام سیکھ سکوں۔ میرا مالک مجھے رات کے اسکول میں داخل کرا دے گا۔''

''ارے! مجھے تو اس کا پتا ہی نہیں تھا۔ کیا یہ سب اچانک ہی طے ہو گیا؟''

''جی، مسز اوئیشی۔''

''کیا کام سیکھو گے؟''

''پرانی چیزوں کی دکان ہے۔''

''ارے! تو تم پرانی چیزوں کی خرید و فروخت کیا کرو گے؟''

''نہیں، میں تو وہاں کا ہیڈ کلرک بنوں گا۔ مجھے بتا رہے تھے کہ اگر میں بھرتی کے قابل ہونے تک وہاں رہا تو مجھے ہیڈ کلرک بنا دیں گے۔''

ایسوکیچی بہت لیا دیا تھا اور پر تکلف زبان بول رہا تھا۔ اس کے تناؤ کو ذرا کم کرنے کے لیے مسز اوئیشی نے کہا: ''اچھے ہیڈ کلرک بننا ایسوکیچی۔ اور مجھے خط لکھتے رہنا۔ تمھیں تصویر کی کاپی مل گئی جو میں نے کل کوتسورو کے ہاتھ بھیجی تھی؟ میں چاہتی ہوں تم اُس دن کی یادکو اپنے دل کے پاس رکھو۔''

دونوں لڑکے ہنسنے لگے۔

''ایسوکیچی، یہ لو پوسٹ کارڈ اور ڈاک کے ٹکٹ۔ یہ میرا الوداعی تحفہ ہے تمھارے لیے۔'' انھوں نے پوسٹ کارڈوں کی ایک گڈی اور ڈاک کے ٹکٹ اسے دیے، یہ دونوں چیزیں انھیں کسی اَور نے تحفے میں دی تھیں۔ انھوں نے اسے ایک رومال بھی دیا۔ تاکے ایچی کو دو کاپیوں اور ایک درجن پنسلوں کا تحفہ ملا۔

''جب چھٹیوں میں گھر آؤ تو مجھ سے ملنے ضرور آنا، ٹھیک ہے؟ میں تمھیں بڑا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم لوگ میرے پہلے اور آخری شاگرد ہو۔ ہمیں ہمیشہ اچھے دوست رہنا چاہیے، ہے نا؟''

''جی،'' صرف تاکے ایچی نے جواب دیا۔

''اور تم ایسوکیچی؟''

''جی۔''

MashalBooks.com

جب گاؤں کے سرے پر بس اسٹاپ دکھائی دینے لگا تو ایسو کیچی نے اپنی ٹوپی پھر اتار لی اور بولا: ''آپ نے اتنے سال مجھ سے اتنا مہربانی کا برتاؤ کیا ہے۔ میں آپ کو خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔''

اس نے یہ الفاظ نرم لہجے میں توتے کی طرح دُہرائے اور ٹوپی جلدی سے دوبارہ سر پر رکھ لی۔ یہ ٹوپی پہن کر، جو کسی بڑے آدمی کے ناپ کی تھی، وہ کسی مزاحیہ سویری کتاب میں دکھائے گئے بچے کی طرح الگ رہا تھا، مگر اس کے باوجود بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ شکاری ٹوپی پہنے ایسو کیچی اور اسکول کی ٹوپی پہنے تاکے اپچی، دونوں نے بس کی پچھلی کھڑکی میں سے ہاتھ ہلائے۔ مسز اوئیشی اُس وقت تک انھیں تکتی رہیں جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ساحل تک گئیں۔ کھاڑی کے پُرسکون پانی کے دوسرے کنارے پر اس کا گاؤں ہمیشہ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ انھیں بڑے ہوتے، اپنے پروں پر اڑنے کی کوشش کرتے بچوں کا خیال آیا۔

''آپ نے اتنے سال مجھ سے اتنا مہربانی کا برتاؤ کیا ہے۔ اب میں آپ کو خدا حافظ کہتی ہوں،'' انھوں نے منہ ہی منہ میں یہ الفاظ دُہرائے جیسے گاؤں سے مخاطب ہوں۔ یہ الفاظ بیک وقت مضحکہ خیز، غمناک اور انسانی حرارت سے پُرمحسوس ہو رہے تھے اور غالباً ان میں ان کے لفظی معنوں سے کہیں زیادہ گہرائی تھی۔

MashalBooks.com

زرد گلاب

مارچ آ پہنچا تھا، لیکن صبح سویرے کی ہوا میں ابھی تک چاقو کی دھار جیسی تیز خنکی موجود تھی۔ سائے میں کھڑے ہوں تو ٹانگیں اور پھر رفتہ رفتہ پورا بدن کپکپانے لگتا تھا۔

شہر ''ک'' کے بس اسٹاپ پر دو مسافر بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا، کوئی ساٹھ برس کی عمر کا فرد تھا، اور دوسری ایک تیس سالہ عورت۔ اتنی صبح ہونے کے باوجود لگتا تھا کہ وہ شہر میں اپنا کام ختم کر کے واپس جا رہے ہیں۔

''اف! کس قدر سردی ہے،'' بوڑھے نے بڑبڑا کر شکایت کی۔

''ہاں، واقعی!'' عورت نے اس کی تائید کی، حالاں کہ بوڑھے نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔

چوں کہ سردی کا موسم انسانی دلوں کو ایک دوسرے سے نزدیک لانے کی صلاحیت رکھتا ہے، تھوڑی ہی دیر میں دونوں مسافر ایک دوسرے سے دوستانہ بات چیت میں مشغول ہو چکے تھے۔

''اس سال سردیاں بہت لمبی ہو گئیں۔''

''ہاں، سچ مچ۔ اب تو بہار کا موسم آنے کو ہے۔''

عورت نے، جو ایک چوکور پیکٹ اپنے سینے سے لگائے کھڑی تھی، دل چسپی کے ساتھ اس سادہ سے بستے کو دیکھا جو بوڑھے کے کندھے پر کھلا ہوا لٹک رہا تھا۔

''یہ آپ اپنے پوتے یا پوتی کے لیے لے جا رہے ہیں؟''

''ہاں۔''

میں نے بھی اپنے بیٹے کے لیے خریدا ہے،'' اس نے اپنے پیکٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا تھا کہ یہ سیل میں مل رہا ہے، اس لیے میں پہلی بس پکڑ کر یہاں آ گئی۔ مگر مجھے ویسا بستہ نہیں مل سکا جیسا ہم لوگ بچپن میں استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ کارڈ بورڈ کے بستے تو سال بھر بھی نہیں چلتے۔''

MashalBooks.com

بڑے میاں نے تائید میں سر ہلایا۔ ''بلیک مارکیٹ میں تو میں نے سنا ہے ایک سے ایک اچھا مل جاتا ہے۔'' وہ منہ کھول کر ہنسے، جس کے اندر اندھیرا تھا اور ان کے کالے دانتوں کے بیچ میں خلا دکھائی دے رہا تھا۔

عورت دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی: ''ہر چیز آج کل بلیک مارکیٹ میں ملنے لگی ہے، بچوں کے بستے تک۔ کتنی بُری بات ہے۔''

''پیسے ہوں تو انسان کچھ بھی خرید سکتا ہے۔ میں تو سنا ہے بعض جگہوں پر بے شمار کیک اور مٹھائیاں تک مل جاتی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے رال کا ایک قطرہ بڑے میاں کے بے دانتوں کے منہ کے کونے سے ڈھلک آیا۔ شاید وہ مٹھائی کے بہت شوقین تھے۔ انھوں نے جلدی سے اپنا منہ ہتھیلی سے صاف کیا اور اپنی جھینپ مٹانے کو ٹھوڑی گھما کر سڑک کی دوسری جانب اشارہ کیا۔

''آیئے اُس طرف چلتے ہیں آنٹی۔ صرف دھوپ ہے جو مفت ملتی ہے،'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے سڑک پار کر کے دوسرے کنارے پر جا کھڑے ہوئے۔ ''آنٹی'' کے خطاب پر مسکراتی عورت بھی ان کے پیچھے چل دی۔ ''آنٹی!'' اس نے اپنے ذہن میں دُہرایا اور لمبے قد والے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

''آپ کہاں رہتے ہیں دادا جان؟''

''میں؟ میں بڑی چٹان کے پاس رہتا ہوں۔''

''اچھا؟ میں صنوبر کے پیڑ کے پاس رہتی ہوں۔''

''اچھا اچھا۔ وہاں میرا ایک دوست بھی رہتا تھا۔ ہم دونوں جہاز پر ساتھ تھے۔ اس کا نام کاکیچی اوئیشی تھا، مگر وہ بہت دن ہوئے مر چکا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو یاد بھی نہیں ہوگا۔''

عورت یہ سن کر چونک پڑی۔ ''اف خدایا! وہ تو میرے ابّا تھے۔''

اس بار بوڑھا چونکا۔ ''کیا عجیب اتفاق ہے! لعنت ہو مجھ پر! کاکیچی کی بیٹی سے اتنے برس بعد مل رہا ہوں۔ ویسے اب مجھے خیال آتا ہے کہ تمھاری صورت اُس سے بہت ملتی ہے۔''

''واقعی! میں تین سال کی تھی جب انکا انتقال ہوا، اس لیے مجھے ان کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ انکل، آپ کتنا عرصہ پہلے ان کے دوست تھے؟'' عورت نے

MashalBooks.com

اسے ''دادا جان'' کے بجائے ''انکل'' کہنا مناسب سمجھا، کیوں کہ اسے خیال آیا کہ اس کے ابّا اگر آج زندہ ہوتے تو اِسی شخص کی عمر کے ہوتے۔

یہ عورت، بلاشبہ، مسز اوئیشی تھیں..... اُس دن سے آٹھ سال کے فاصلے پر جب ہم نے انھیں آخری بار دیکھا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں جو انھوں نے ایک جہازی کی بیوی کی حیثیت سے گزارے، دنیا میں اس لمحے سے کہیں زیادہ ہیبت ناک تبدیلیاں آ چکی تھیں جب انھوں نے غصے میں آ کر اسکول کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ چین والا واقعہ ہو چکا تھا؛ جاپان، جرمنی اور اٹلی کے مابین کومنترن مخالف معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے۔ وہ تحریک جسے ''قومی روح کی بیداری کی تحریک'' کا نام دیا گیا، چلائی جا چکی تھی جس نے لوگوں کو یہ سبق سکھا دیا تھا کہ خواب میں بھی سیاست پر بات نہ کریں، بلکہ جنگ کا سامنا کریں، قومی مقصد پر یقین رکھیں اور دل و جان سے اس کی خدمت میں لگے رہیں۔ انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اپنی بے اطمینانی کو پوشیدہ رکھے اور نظر انداز کیے بغیر ان کا زندگی گزارنا ناممکن ہو گیا تھا۔

انہی حالات میں مسز اوئیشی تین بچوں کی ماں بنی تھیں۔ بڑے والے دو لڑکے تھے: دائے کیچی اور نامیکی؛ سب سے چھوٹی لڑکی تھی: یاتسو۔ وہ بہت کچھ عام گھر داری کرنے والی عورتوں جیسی دکھائی دینے لگیں تھیں، یہی وجہ ہے کہ انھیں ''آنٹی'' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ لیکن انھیں قریب سے دیکھنے پر، خاص طور پر ان کی چمکیلی آنکھوں کو دیکھنے پر، اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ محض ''آنٹی'' نہیں ہیں۔

''انکل، کیا آپ میرے ساتھ چل کر چائے پینا پسند کریں گے؟'' انھوں نے بس اسٹاپ کے پاس بنے ہوئے چائے کے اسٹال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔ وہ بڑے میاں سے اپنے باپ کے بارے میں اَور باتیں جاننا چاہتی تھیں۔ مگر انھوں نے مضبوطی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، شکریہ۔ بس آنے والی ہے۔ میرا خیال ہے مجھے یہیں کھڑے رہنا چاہیے،'' بڑے میاں پہلے کی نسبت زیادہ پرتکلف لہجے میں کہا۔ ''اور کاکیچی کی دلھن کا کیا حال ہے؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں، شکریہ۔'' وہ اپنی بوڑھی ماں کے لیے ''دلھن'' کا خطاب سن کر مسکرا دیں۔ گھر پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے امّاں کو یہ بات بتائیں گی۔ ٹھیک اس وقت

مخالف سمت سے ایک بس آ کر رکی اور ہارن بجانے لگی۔ وہ فوراً بس اسٹاپ کے سائن بورڈ سے الگ ہٹ کر کھڑی ہوگئیں، تاکہ بس کے ڈرائیور کو پتا چل جائے کہ انھیں اس میں سوار نہیں ہونا ہے، مگر اس کے باوجود بس وہاں آ کر رک گئی۔ چائے کے اسٹال کے نیچے سائبان تلے کھڑے ہو کر انھوں نے بس سے اترنے والے مسافروں پر بے دھیانی سے نظر ڈالی۔ اس پوری بھری ہوئی بس میں سے صرف نوجوان مرد اتر رہے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے دروازے سے باہر آ رہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ پوری بس یہیں خالی ہو جائے گی۔ انھیں دیکھ کر مسز اوئیشی کو خیال آیا کہ آج شہر کے پبلک ہال میں فوجی بھرتی کے لیے امتحان ہونے والا ہے۔ ''اچھا، یہ بات ہے!'' انھوں نے ایک ایک کر کے اترتے ہوئے لڑکوں کے نوجوان چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

''اوہ، مسز کوئیشی!'' چونکا دینے کی حد تک اونچی آواز میں کوئی چلّایا۔ تقریباً اسی وقت مسز اوئیشی کے منہ سے بھی پکارتی ہوئی آواز نکلی: ''ارے نیتا!''

ایک کے بعد ایک اترتے لڑکوں کو غور سے دیکھ کر مسز اوئیشی کہنے لگیں: ''اوہو، اوہو! یہ تو سب کے سب یہاں موجود ہیں!'' نیتا کے پیچھے بس سے اترنے والوں میں ایسو کیچی، تاکے ایچی، تاداشی اور کیچی جل شامل تھے، یعنی راس کے گاؤں کے تمام لڑکے جو اُن کے شاگرد رہ چکے تھے۔

''آپ کو دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، مسز اوئیشی،'' سب سے پہلے بولنے والا تاکے ایچی تھا۔ وہ تو کیو یونیورسٹی میں آخری سال کا طالبِ علم تھا۔ اس کا چہرہ سُت گیا تھا اور اس کے وجود میں گویا بڑے شہر کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس کے بعد تاداشی خوش طبعی کی مسکراہٹ کے ساتھ آداب کہنے کو جھکا اور پھر شرما کر اپنا کان کھجانے لگا۔ وہ کوبے کے شب یارڈ میں کام کرتا تھا اور اس کے چہرے پر تربیت یافتہ ہنرمند کی سی مضبوطی تھی۔ اس کے بعد ایسو کیچی آگے بڑھا جیسے اپنی باری کا انتظار کرتا رہا ہو۔ ''آپ کیسی رہیں، مسز اوئیشی؟'' اس نے اپنے غیر معمولی زرد چہرے پر مہذبانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے سوال کیا۔

ہمشیہ کی طرح خاموش اور لیے دیے رہنے والے کیچی جی نے دوسروں کے پیچھے کھڑے کھڑے دھیمی آواز میں آداب کیا۔ وہ گاؤں سے باہر نہیں نکلا تھا، بلکہ وہیں مزدوری اور ماہی گیری کرتا رہا تھا۔

نیتا اپنے ابّا کا نائب تھا جو صابن بنانے کی فیکٹری چلاتے تھے۔ اپنے نئے سلے

ہوئے خاکی سوٹ میں وہ دوسرے لڑکوں سے زیادہ خوش حال لگتا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے آداب وغیرہ سے گریز کیا۔ ''دو ایک دن پہلے میری فوجیکو سے ملاقات ہوئی،'' وہ بولا، اور پھر فخریہ لہجے میں اپنی بات دُہرائی: ''میں فوجیکو سے ملا تھا۔'' مسز اوئیشی نے اسے دانستہ نظر انداز کر دیا اور ایک ایک کر کے اپنے اردگرد کھڑے لڑکوں کو دیکھنے لگیں۔ آٹھ برس کے عرصے نے چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو لمبے تڑنگے نوجوانوں میں منقلب کر دیا تھا۔

''تو امتحان کا دن آ بھی گیا!'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور لڑکوں کے چہرے دُھندلا گئے۔ مگر پھر انھیں احساس ہوا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے، اور فوراً اپنی سابق استانی والی آواز میں بولیں: ''بس اب تم روانہ ہو جاؤ۔ اور ہاں، تم سب ایک ساتھ مجھ سے ملنے آؤ گے؟''

وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس سے جدا ہو گئے، جیسا کہ نوجوان لڑکوں کا طریقہ ہے۔ وہ ملے جلے جذبات اور احساسات دل میں لیے انھیں دور تک جاتے دیکھتی رہی۔ اتنے برسوں میں پہلی بار استانی کی حیثیت سے بات کرنے سے انھیں بڑی تر و تازہ مسرت کا احساس ہوا۔

پھر وہ مڑیں اور چائے کے اسٹال کے پاس بڑے میاں کو بس کے پہیوں سے اڑتی دُھول سے بچ کر کونے میں کھڑے دیکھا۔ پاس ہی ایک کیاری میں زرد گلابوں کی ایک جھاڑی تھی۔ اس پر ڈھیر ساری کلیاں تھیں جن کے بوجھ سے اس کی نازک شاخیں جھکی جا رہی تھیں۔ بڑے میاں نے بڑی بے نیازی سے ایک ٹہنی توڑ لی۔ پھر وہ بھی جاتے ہوئے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے بولے: ''کتنی شرم کی بات ہے! ایسے مسکراتے ہوئے نوجوان لڑکوں کو گولیوں کا نشانہ بننے کے لیے کیوں بھیجا جا رہا ہے؟''

''واقعی، کتنے افسوس کی بات ہے!''

''میں یہ بات زور سے نہیں کہہ سکتا۔ اگر میں کہہ بیٹھوں تو مجھے یہ بنا دیا جائے گا۔'' انھوں نے بستہ ہاتھ میں تھامے تھامے اپنے بازو پیٹھ کے پیچھے کر لیے جیسے انھیں باندھ دیا گیا ہو، اور دھیمی آواز میں کہتے رہے: ''امن و امان میں خلل ڈالنے کا قانون، جیسا کہ تم جانتی ہی ہو۔ مجھے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔''

اب وہ کسی جوان آدمی کی طرح بات کر رہے تھے جیسے ان کی پچھلی داڑھیں

دوبارہ نکل آئی ہوں۔ مسز اوئیشی کو اس قانون سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس قانون کا نام ان کے ذہن میں مسٹر اینا گاوا کے نام کے ساتھ وابستہ تھا جنھوں نے ''گھاس کے بیج'' نامی مجموعہ مرتب کیا تھا اور جنھیں اسی قانون کے تحت قید کیا گیا تھا۔ قید سے تو وہ کچھ عرصے بعد رہا ہو گئے، لیکن نہ صرف اپنے کام پر نہ لوٹ سکے بلکہ اب تک غیر منصفانہ سلوک کا شکار تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان کی امّاں دیوانگی کے سے عالم میں ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور ہر شخص کو بتاتی پھرتی تھیں کہ ان کا بیٹا اپنی غلطیوں پر کس قدر پشیمان ہے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس افواہ میں کہاں تک سچائی تھی۔ مگر اتنی بات یقینی تھی کہ مسٹر اینا گاوا اب تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے اور مرغی خانہ چلاتے تھے۔ انھوں نے دنیا ترک نہیں کی تھی، مگر دنیا نے انھیں ترک کر دیا تھا۔ ان کے مرغی خانے کے انڈے تک لوگ مشکل سے خریدتے تھے، جیسے ان میں زہر بھرا ہو، اور ایک زمانے میں تو انھیں کوئی بھی گاہک نہیں ملتا تھا۔ زمانے نے لوگوں کو تابعداری سکھا دی تھی اور وہ کہاوت کے بندروں کی طرح اپنا منہ، آنکھیں اور کان بند رکھنے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ البتہ مسز اوئیشی کے سامنے کھڑے ہوئے بڑے میاں اس سے یوں مخاطب تھے جیسے انھیں بغاوت پر اکسا رہے ہوں۔

''ٹھیک ہے، میں ان کے مرحوم دوست کی بیٹی ہوں، مگر آخر ہم آج پہلی بار ملے ہیں۔ پھر انھیں مجھ پر اتنا اعتماد کس طرح ہو گیا؟'' وہ کچھ شک میں پڑ گئیں اور موضوع بدل دیا۔

''آپ کی میرے ابّا سے کب دوستی ہوئی تھی؟''

بڑے میاں مسکرائے، ان کا بے دانت کے بوڑھے والا انداز لوٹ آیا۔

''دیکھو، یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس وقت ہم دونوں کی عمر غالباً سترہ یا اٹھارہ سال کی تھی۔ ہم دونوں زندگی میں کچھ کر گزرنا چاہتے تھے۔ ہم نے کسی غیر ملکی جہاز میں چھپ کر امریکا جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہم نے سوچا کہ سیاٹل یا کسی اَور بندرگاہ کے قریب سمندر میں کود جائیں گے اور تیر کر ساحل پر جا پہنچیں گے۔''

''اوہ میرے خدا! ویسے میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں نے ایسا کیا بھی تھا۔''

''ہاں بالکل۔ ہم ظاہر یہی کرتے تھے کہ امریکا جا کر دولت کمانا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہم جبری بھرتی سے بچنا چاہتے تھے۔ اگر آج کل ہم ایسی حرکت کرتے تو ہمیں یہ بنا دیا جاتا۔'' انھوں نے اپنے ہاتھ پھر پیٹھ کے پیچھے کر لیے اور مسکرانے لگے۔

''مگر آپ کو اپنے منصوبے میں کامیابی تو نہیں ہوئی، یا ہوئی؟''

MashalBooks.com

''نہیں ہوئی۔ مگر اُس زمانے میں جہازی بھرتی سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ اور اس دوران میں اور تمھارے ابّا دونوں سمندر کی زندگی کے دل دادہ ہو چکے تھے۔ سو ہم نے لائسنس یافتہ جہازی بننے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے بڑی سخت محنت کی۔ ہم نے اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی، اس لیے سیکنڈ میٹ بننے میں پانچ سال لگے۔ کا کیچی نے مجھ سے ایک سال پہلے امتحان پاس کر لیا۔ اس پر میں نے اَور زیادہ محنت کی اور اگلے سال لائسنس حاصل کر لیا۔ لیکن.....'' وہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ خوش خبری وہ اپنے دوست کا کیچی کو نہ سنا سکے کیوں کہ اس دوران اس کا جہاز ڈوب گیا تھا اور وہ مر چکا تھا۔

اس بوڑھے شخص کی باتوں سے مسز اوئیشی کے باپ کی جو تصویر سامنے آتی تھی وہ اُس سے مختلف تھی جو ان کی امّاں نے بتائی تھی۔ جب انھوں نے اپنے ابّا کی جوانی کا تصور کیا تو جذباتی ہونے کے بجائے ان کا مسکرانے کو جی چاہا۔ شاید یہ اس لہجے کی وجہ سے تھا جس میں بڑے میاں اپنے دوست کا ذکر کر رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر مسز اوئیشی اپنے باپ کو ایک زندہ دل اور متاثر کن جوان آدمی کے طور پر دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن یہ بات انھیں آج پہلی بار معلوم ہوئی تھی کہ ان کے ابّا کو جبری بھرتی میں جانا ناپسند تھا۔ کیا ان کی امّاں نے یہ بات اس لیے نہیں بتائی تھی کہ انھیں خود پتا نہیں تھا؟ یا وہ بھی دوسروں کی طرح اپنے وطن کی ایک تابعدار شہری تھیں؟ مسز اوئیشی نے طے کیا کہ ''دلھن'' والی بات بتانے کے بعد وہ امّاں سے اس کے بارے میں پوچھیں گی۔ یہ سب خیالات ذہن میں لیے وہ بڑے میاں سے باتوں میں مصروف رہیں۔

''آپ کتنا عرصہ جہاز پر رہے؟''

''کوئی دس برس پہلے تک۔ تب تک میں ایک چھوٹے جہاز کا کپتان بن چکا تھا۔ میں اپنے بیٹے کو نیوی گیشن اسکول میں بھیجنا چاہتا تھا تاکہ وہ کسی دقّت کے بغیر جہازی بن جائے۔ مگر اس نے صاف کہہ دیا کہ اسے اس کام سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اسے ایک تجارت اسکول میں بھیج دیا۔ بعد میں وہ ایک بینک میں کلرک ہو گیا، مگر پھر اسے فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور وہ مارا گیا۔''

''محاذ پر؟''

''ہاں۔''

''اوہ!''

''نومون ہان کے محاذ پر۔ اور یہ میں اس کے بیٹے کے لیے لے جا رہا ہوں،''
انھوں نے ہاتھ میں تھامے بستے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

مسز اوئیشی کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ''بیٹوں کا ہونا بڑی فکر کی بات ہے،'' مگر انھوں نے خود کو بمشکل روک لیا۔

بس میں خاصے مسافر تھے، اس لیے بڑے میاں اور مسز اوئیشی کو ایک دوسرے کے ساتھ جگہ نہ مل سکی۔ مسز اوئیشی کو بس کے پچھلے حصّے میں جگہ ملی۔ وہ آنکھیں موند کر اپنے سابق شاگردوں کے بارے میں سوچنے لگیں جن سے ابھی کچھ دیر پہلے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ معائنہ کرنے والوں کے سامنے، سر سے پیر تک ننگے، کھڑے ہوں گے۔ سپاہیوں کے قبرستان میں لکڑی کے بنے کتبوں کی تعداد متواتر بڑھ رہی تھی، لیکن نوجوانوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ان کے بارے میں نہ سوچیں بلکہ اپنے آبا و اجداد کے مقبروں پر توجّہ مرکوز رکھیں۔ یوں کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ ان سے جنگ کے شہیدوں پر مناسب توجّہ دینے، ان کی تحسین کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کو سعادت جاننے کی توقع کی جاتی تھی۔ تاکے ایچی کس مقصد سے تعلیم حاصل کر رہا تھا؟ ایسو کیچی کس کے لیے تاجر بننا چاہتا تھا؟ کیا تاداشی کو، جس نے بچپن میں نان کمیشنڈ آفیسر بننے کی خواہش کی تھی، جنگی جہازوں اور قبرستان میں کوئی رشتہ دکھائی دیتا تھا؟ ایسے خطرناک زمانے میں جب لوگ اپنے اصل خیالات اپنی مسکراہٹ کے پیچھے چھپائے رکھنے پر مجبور تھے، صرف ایک نیتا تھا جو فکر سے آزاد معلوم ہوتا تھا اور زور زور سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن کسے معلوم کہ نیتا کے ذہن میں کون سے خیالات پوشیدہ ہیں؟

یہ بات یقینی تھی کہ اُس چھوٹے سے گاؤں کے یہ پانچ لڑکے، جو اس سال بھرتی کی عمر کو پہنچے تھے، سپاہی بنا کر دور دراز کی جگہوں پر بھیج دیے جائیں گے۔ ان میں سے کتنے خیریت سے کبھی گھر واپس پہنچ سکیں گے؟ فوج اس قسم کا ادارہ ہے جہاں سپاہیوں کو ہفتے بھر کی چھٹی ''انسانی وسائل'' میں اضافے کی غرض سے دی جاتی ہے۔ ان ''انسانی وسائل'' کو جنم دینے والی عورتوں کو اس فکر میں پڑنے کی اجازت نہیں کہ ان کے بچوں کی پیدائش لکڑی کے کتبوں میں اضافے کا سبب بنے گی۔ کیا یہ مرد اور یہ عورتیں خود کو اپنی قسمت کے سپرد کر دینے پر مجبور ہیں؟ مردوں کے لیے تو بہرحال اپنی تقدیر سے بھاگ نکلنا ناممکن ہے اور عورتیں؟

MashalBooks.com

مسز اوئیشی کے اوّلین شاگردوں میں جنتی لڑکیاں تھیں، ان میں صرف میسا کو ایسی تھی جسے سخت دشوار حالات سے نہیں گزرنا پڑ رہا تھا۔ گرین اسکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ تو کیو کے گھر داری کی تربیت دینے والے ایک اسکول میں داخل ہوگئی تھی۔ ابھی وہ اسی اسکول میں تھی کہ اس کی شادی ہوگئی اور وہ بہت جلد ایک بچے کی ماں بن گئی۔ موجودہ زمانے کی دشواریوں کے باوجود، اس کے حالات غیر معمولی طور پر اچھے رہے، بالکل کسی ایسے شخص کی طرح جو ایک سرد، کاٹتی ہوئی تیز ہوا کے دن، کسی دھوپ بھرے پارلر میں مزے سے لیٹا ہوا ہو۔

دوسری جانب ماسونو کو، جسے موسیقی سے عشق تھا، انتہائی سخت حالات سے گزرنا پڑا تھا۔ گلوکار بننے کی دُھن میں، اپنے والدین سے بغاوت کرتے ہوئے، وہ کئی بار گھر سے بھاگی۔ ایک بار اسے ایک مقامی اخبار کے منعقد کرائے ہوئے مقابلے میں پہلا انعام ملا جس میں اس نے اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر شرکت کی تھی۔ اس کی پرفارمنس کی اخبار میں تعریف بھی چھپی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گھر سے بغیر اجازت نکلی تھی۔ ہر بار جب وہ گھر سے غائب ہوتی، اُسے ڈھونڈ نکالا جاتا؛ ہر بار جب اسے گھر واپس لایا جاتا، وہ دوبارہ گھر سے فرار ہو جاتی۔ اس کے گھر سے بھاگنے کی وجہ ہمیشہ گانے کی خواہش ہوتی تھی۔ آخر اپنی گانے کی خواہش کو دبانا اس پر کیوں فرض تھا جب کہ وہ گانے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی؟ جب اسے تیسری بار ڈھونڈ کر واپس لایا گیا، وہ گیشا بننے کے کنارے پر تھی۔ اس کی امّی اسے لینے آئیں تو ماسونو ان سے لپٹ کر رونے لگی اور بولی: ''آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ سیمی سین بجانا سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کہا تھا نا؟'' کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب سے اس کا موسیقی کا جنون سیمی سین بجانے کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے والدین اس کے ساز بجانے کو درست سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں، ماسونو کا گیشا بن جانا انھیں ہرگز منظور نہ تھا، حالاں کہ وہ خود ایک ریستوراں چلاتے تھے اور اُن کا گیشاؤں سے کاروباری تعلق رہتا تھا۔

ماسونو نے ایک اَدھیڑ عمر شخص سے شادی کی جس سے اس کی ملاقات گھر کے فرار ہونے کے ایک وقفے میں ہوئی تھی، اور یوں اپنا گھر بسا لیا۔ جب اس کی امّی کی عمر زیادہ ہوگئی تو اس نے ریستوراں کی مالکہ کا نام سنبھال لیا۔ کبھی کبھار جب راہ چلتے مسز اوئیشی کی اس سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ بے اختیار ان سے لپٹ جاتی اور کہتی: ''مسز اوئیشی، میں آپ کو

اتنا یاد کرتی ہوں!'' وہ اپنی مسّرت کا اظہار بالکل بچوں کی طرح کرتی، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ حالاں کہ اپنے سنجیدہ میک اَپ کے باعث اس کی عمر بیس برس سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

کوتوئے کا کیا بنا جو چھٹی کلاس کے بعد پڑھائی ترک کرنے اور ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی تھی، اور ایک روز شادی کر لینے کی امید رکھتی تھی؟ کوئی رشتہ آنے سے پہلے وہ تپ دِق میں مبتلا ہو کر گھر لوٹ آئی۔ مسز اوئیشی کو یہ خبر بہت پہلے ملی تھی کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی اپنے گھر کی سامان کی کوٹھری میں تنہا پڑی ہوئی ہے۔

جہاں تک فوجیکو کا تعلق ہے، جو اُن لڑکیوں میں شامل تھی جو چھٹی کلاس سے آگے پڑھنے سے قاصر رہیں، اس کے بارے میں ایک ناخوش گوار افواہ سننے میں آئی تھی۔ نیتا جس فوجیکو سے ملاقات کا تذکرہ کر رہا تھا، وہ یہی طوائف فوجیکو رہی ہوگی۔ مسز اوئیشی نے یہ بات نیتا کے چہرے کے تاثر سے بھانپ لی تھی اور جان بوجھ کر اس سے اَور کچھ نہیں پوچھا تھا۔ انھیں کوتسورو کی زبانی اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ کوتسورو کا کہنا تھا کہ فوجیکو کو اس کے گھر والوں نے بیچ دیا تھا۔ انھوں نے لڑکی کو فرنیچر یا پرانے کپڑوں کی طرح، گھر کا خرچ چلانے کی غرض سے بیچ دیا۔ اگر فوجیکو کو، جو گھر میں کوئی کام کاج کیے بغیر بڑی ہوئی تھی، پہلی بار زندگی کی حقیقتوں کا اندازہ ہو گیا، خواہ یہ اس ذلّت آمیز پیشے ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو، تو شاید سننے والوں کو کم سے کم اسی بات پر اطمینان محسوس کرنا چاہیے تھا۔ مگر لوگ اسے حقارت سے دیکھتے اور تضحیک کا نشانہ بناتے تھے۔

پہلے ماتسوئے، جو لوگوں کی یادداشت سے محو ہو چکی تھی، اور اب فوجیکو ..... یہ لڑکیاں کس طرح تضحیک کی حق دار ہیں؟ کم سے کم مسز اوئیشی کے دل میں ان دونوں کی وقعت اور محبت برقرار تھی۔

''کیسی ہو تم، ماتسوئے؟ اور فوجیکو، تمھارا کیا حال ہے؟'' وہ اکثر تصور میں ان دونوں سے باتیں کیا کرتیں۔

ایک طرف ماتسوئے اور فوجیکو کے ساتھ زندگی نے ناانصافی کا سلوک کیا تھا، تو دوسری طرف کوتسورو اور سانائے خوش حال زندگی گزار رہی تھیں۔ سانائے نے ٹیچرز اسکول سے شان دار ریکارڈ کے ساتھ تعلیم مکمل کی تھی اور اس کے انعام کے طور پر اسے اسی اسکول میں تدریسی ملازمت دے دی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب پہلے سے بھی زیادہ چمکتی

تھیں۔ مسز اوئیشی کی بدولت سانائے کی کوتسورو سے اچھی دوستی ہوگئی تھی جس نے اوساکا کے مِڈ وائفری اسکول سے اپنی تعلیم اعزاز کے ساتھ پوری کی تھی۔ کوتسورو کا ارادہ مزید تجربہ حاصل کرنے کے بعد گاؤں واپس آنے کا تھا۔ وہ اپنے بھیجے ہوئے لفافوں پر باہر کی طرف، دانستہ یا بے خیال میں ''مسز اوئیشی کوئیشی'' لکھ دیتی تھی۔ مگر بہرحال، جیسا کہ مسز اوئیشی کی امّاں نے پیش گوئی کی تھی، باتونی کوتسورو اب قدرے بُردبار ہو چکی تھی، اور خاموش طبع سانائے خاصی باتونی ہوگئی تھی۔ بچوں کے بڑی عمر تک پہنچنے کا عمل کس قدر پُر اسرار ہوتا ہے!

یہ دونوں لڑکیاں سال میں کم سے کم دو بار، ایک دوسرے کے ساتھ، مسز اوئیشی سے ملنے آتی تھیں؛ ایک بار عموماً گرمیوں کی چھٹیوں میں اور دوسری بار نئے سال کے موسم میں۔ ان کے تحفے ہمیشہ ایک ہی ہوتے تھے، جس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں ایک ہی چیز تحفے میں لاتی تھیں بلکہ یہ کہ کوتسورو ہر بار اوساکا کا بنا ہوا باجرے کا کیک لاتی اور سانائے تاکاماتسو کے بنے ہوئے بسکٹ۔ عورت پن کی عمر کو پہنچتی کوتسورو مسلسل موٹی ہوتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں مزید سکڑ کر بس لکیروں جیسی رہ گئی تھیں۔ اس کی طبیعت کی مضبوطی اس کی آنکھوں کے چھپ جانے کے باعث ظاہر نہ ہوتی تھی۔ جب وہ مسکراتی تو باقی لوگ بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس کی عادت تھی کہ پہلے کھلکھلا کر ہنستی اور پھر اپنا تحفہ پیش کرتی، کہتی: ''میرا تحفہ!'' ایک بار کہنے لگی: ''کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ہر بار ایک ہی چیز تحفے میں لانا کافی پھوہڑ پن کی بات ہے، لیکن بچپن میں جب کوئی یہ کیک لاتا تھا تو میں خوشی سے ناچ اٹھتی تھی۔ اسی لیے میں ہر بار یہی تحفہ لاتی ہوں۔'' سانائے نے بھی اپنا بسکٹوں کا تحفہ انھیں دیتے ہوئے کہا تھا: ''کہا جاتا ہے کہ بے وقوف لوگ ایک ہی چیز پر اٹکے رہ جاتے ہیں!''

مسز اوئیشی کا بڑا دائے کیچی ان دونوں کو ''تحفے والی آنٹیاں'' کہہ کر انکا خیر مقدم کیا کرتا تھا۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا کہ یہ دونوں آئی ہوں اور پورا دِن وہاں مسّرت بھری سرگرمیوں میں نہ گزارا ہو۔ لیکن جوں جوں جنگ طویل ہوتی گئی، ان دونوں کے لیے اپنے تحفے حاصل کرنا دشوار ہوتا گیا۔ اِدھر کچھ دنوں سے کوتسورو سُوتی کپڑے کی پٹّیاں لانے لگی تھی جو مِڈ وائفیں استعمال کرتی ہیں، اور سانائے نے دائے کیچی کے لیے کاپیاں اور پنسلیں لانی شروع کر دی تھیں جو ابھی پڑھنے کی عمر کو بھی نہ پہنچا تھا۔

آج مسز اوئیشی نے دائے کیچی کے لیے بستہ خریدا تھا جواب آخر اسکول جانے کے قابل ہو رہا تھا۔ گھر واپس جاتے ہوئے مسز اوئیشی کا دل بہت سی یادوں سے لبریز ہو رہا تھا، جس کی وجہ غالباً ان کی اپنے سابق شاگردوں سے اتفاقی ملاقات تھی۔

''صنوبر گاؤں! کوئی ہے اترنے والا؟'' کنڈکٹر نے آواز لگائی۔ مسز اوئیشی چونک کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھیں۔ انھوں نے جلدی سے بڑے میاں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور ابھی پائیدان پر پیر رکھا ہی تھا کہ اچانک انھیں دائے کیچی کی آواز سنائی دی: ''امّی!'' بیٹے کی اس تیز، شفاف آواز نے ان کے ذہن کو اُلجھاتے تمام خیالوں کو یک دم دور کر دیا۔

''امّی، میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔''

عام طور پر اس کی شفاف آواز سن کر اس کی امّی مسکرا دیتی تھیں۔ مگر آج کا معاملہ کچھ غمناک سا لگتا تھا۔ بہر حال، وہ مسکرائیں ضرور، اور ان کا بیٹا کچھ اطلاع دیتے اور کچھ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے بولا: ''آپ کو اتنی دیر ہو رہی تھی کہ مجھے رونا آنے لگا۔''

''سچ مچ؟''

''میں بس رونے ہی والا تھا کہ مجھے بس کا ہارن سنائی دیا اور پھر آپ نظر آ گئیں۔ میں نے ہاتھ بھی ہلایا تھا مگر آپ اِدھر دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔''

''اوہ، واقعی؟ دراصل میں کچھ اَور سوچ رہی تھی اس لیے میں نے نہیں دیکھا۔ میں تو یہاں اترنا ہی بھُولی جا رہی تھی۔''

''اچھا؟ آپ کیا سوچ رہی تھیں؟''

اسے جواب دیے بغیر مسز اوئیشی نے بستے کا پیکٹ اسے تھما دیا۔ لڑکے نے اسے یوں لے لیا جیسے وہ اسی کو لینے یہاں آیا ہو۔

''ارے! یہ بستہ ہے؟ بہت چھوٹا سا ہے!''

''نہیں نہیں، چھوٹا تو نہیں ہے۔ نکال کر دیکھنا۔''

بستہ اس کے کندھے پر بالکل درست آ گیا۔ بلکہ دیکھا جائے تو تھوڑا سا بڑا ہی تھا۔ دائے کیچی دوڑنے لگا۔

''نانی اماں! بستہ!'' وہ اپنے گھر کی طرف منہ کر کے بھاگتے ہوئے چلّایا، جیسے

MashalBooks.com

اپنی رفتار کی کسر آواز سے نکال رہا ہو۔

پیچھے سے دیکھنے پر اس کے دوڑنے اور کندھے ہلانے سے اس کے جلد از جلد بڑا ہو جانے کی خواہش ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن اگر بڑا ہونے پر جنگ ہی اس پیارے سے لڑکے کی منتظر ہے تو پھر اس کو جنم دینے، پیار کرنے اور پالنے کا حاصل کیا ہوا؟ انسانی جانوں کی قدر کرنا اور انھیں گولیوں کی زد میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانا کیوں ممنوع ہے؟ کیا ''امنِ عامّہ کے قانون'' کا مطلب انسانی جانوں کی قدر کرنے اور ان کا تحفظ کرنے کے بجائے خیالات کی آزادی کو محدود کرنا ہے؟

دائے کیچی کو آگے آگے بھاگتا دیکھ کر مسز اوئیشی کو لگا کہ اس کو بھی اُسی راستے پر چلنا ہوگا، جس پر تاکے اپچی، نیتا، تاداشی، کیچی جی اور اُن کے ساتھ بس سے اتر کر پبلک ہال کی طرف جانے والے تمام لڑکے روانہ ہوئے ہیں۔ ان کا دل ڈوبنے لگا۔ ''ابھی تو میرا بیٹا اسکول جانے کے قابل ہوا ہے، اگر مجھے اس بات کا اتنی شدت سے احساس ہو رہا ہے تو اَور کتنی بے شمار مائیں میری طرح اذیت جھیل رہی ہوں گی،'' وہ سوچنے لگیں۔ ''ان سب ماؤں کے دلوں کو نوچ کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا ہے اور کوڑے ہی کی طرح جلایا جانے والا ہے۔''

''سپاہی گھوڑے دوڑاتے ہیں
بندوق کندھوں پر رکھے
وہ جوش میں آگے بڑھتے ہیں
اور میں بھی سپاہی بنوں گا!''

گھر میں سے بچوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر گانے کی کوشش میں بے سُرے ہو رہے تھے۔ مسز اوئیشی گھر میں داخل ہوئیں تو انھوں نے اپنے بچوں کو دائرے میں مارچ کرتے دیکھا۔ دائے کیچی، کندے پر بستہ لٹکائے، نامیکی اور یاتسو کی قیادت کر رہا تھا۔ بچوں کی نانی امّاں، مسّرت سے دمکتے چہرے کے ساتھ، انھیں تک رہی تھیں۔ مسز اوئیشی برہمی سے، گویا انھیں طعنہ دیتے ہوئے بولیں: ''افوہ! تم لوگوں کو کس قدر شوق ہے سپاہی بننے کا! تمھاری نانی امّاں کا تو کوئی بیٹا ہے نہیں، انھیں کیا پتا بیٹوں کی ماؤں پر کیا گزرتی ہے۔ ویسے انھیں کچھ سوچنا چاہیے!''

''دائے کیچی!'' انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔ لڑکا سہم گیا اور حیرت سے منہ کھول کر

رہ گیا۔ نامیکی اور یاتسو بھاگتے اور گاتے رہے۔ انھوں نے ایک جھاڑو اور ایک بلا بندوقوں کی طرح کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ مسز اوئیشی نے جلدی سے دائے کیچی کو سینے سے لگا لیا جیسے اپنی ڈانٹ کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ اگرچہ کندھے پر لٹکے بستے کی وجہ سے اس کو چھونا انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی روبوٹ کو چھو رہی ہوں، لیکن اس کا بدن خوشی کے مارے کپکپا رہا تھا۔ سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے اسے اپنی ماں کی محبت کا ایسا اظہار کم ہی نصیب ہوتا تھا، اور یوں سینے سے لگا لیے جانے پر چھ سالہ لڑکا فاتحانہ طور پر خوش تھا۔ وہ مسکرایا اور ابھی کچھ کہنے ہی کو تھا کہ نامیکی اور یاتسو نے ان دونوں کو دیکھ لیا۔ وہ چلاّتے ہوئے اِس طرف بھاگے۔ انھیں کی طرح چلاّتے ہوئے مسز اوئیشی نے ان دونوں کو بھی اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ''کتنے پیارے شیطان بچے ہو تم لوگ! میں تمھیں کیسے مرنے دے سکتی ہوں!'' وہ ان تینوں کو چمٹائے ہوئے اپنے لفظو کی دُھن پر جھولا سا جھلانے لگیں۔ تینوں بچے کورَس میں شور مچاتے رہے۔ وہ ابھی اتنے سیانے نہیں ہوئے تھے کہ اپنی ماں کے لفظوں کا مطلب سمجھ سکیں۔

بھرتی کے قابل لڑکوں کو موسمِ بہار میں جسمانی معائنہ کیا جاتا اور اس کے نتائج کی بنیاد پر، اسی وقت، فوجی سروس کی مختلف شاخوں میں تعینات کر دیا جاتا، جیسے سبزیوں کی دیہاتی نمائش میں مولیاں اور شلجم چھانٹ چھانٹ کر الگ کیے جا رہے ہوں۔ سال کے ختم ہوتے ہوتے وہ سب، کسینی نعروں کی گونج میں اپنی اپنی مقررہ جگہ کے لیے روانہ ہو جاتے۔ یہ سلسلہ بہت طویل عرصے سے چل رہا تھا۔ مگر چوں کہ جنگ کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حالات کی سنگینی بھی بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے یہ سست رو طریقہ اب قابلِ عمل نہیں رہا تھا۔ اب بھرتی ہونے کا مطلب جہاز میں بھر کر سیدھے محاذ پر بھیج دیا جاتا تھا۔ بندرگاہ پر شاہ بلوط کے پتّوں سے بنی محراب پر لگا ''خدا حافظ اور خوش آمدید'' کا بینر بدرنگ ہو چلا تھا۔ محاذ پر جاتے اور محاذ سے لوٹتے سپاہیوں کے لیے خدا حافظ اور خوش آمدید کے نعرے سارا سال گونجا کرتے تھے، اور وقفے وقفے سے چوکور بکسوں میں بند ''فاتح سپاہیوں'' کی راکھ بھی سمندری ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس سبز محراب سے گزرتی رہتی تھی۔

ایسی سبز محرابیں جاپان بھر میں جگہ جگہ بنائی گئی تھیں اور بے شمار نوجوان لڑکے جلوسوں کی شکل میں ان محرابوں کے نیچے سے رخصت ہو رہے تھے، اور اس کا کوئی انجام

دکھائی نہ دیتا تھا۔ ۱۹۴۱ میں بہرا کاہل کی جنگ چھڑ گئی اور تحسین اور تعریف کے نعروں کے جلوس میں مزید سپاہیوں کو محاذ پر بھیجا گیا۔

جب اُس سال بھرتی ہونے والے نوجوان، جن میں نیتا، کیچی جی اور ایسو کیچی شام تھے، اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے تو یہ جنگ ابھی خاصی دور تھی۔ ۱۸ دسمبر کو شہنشاہ کے نام پر اس جنگ کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔ ان کی روانگی کے دن مسز اوئیشی نے ان کو اُسی پرانی اور محبوب تصویر کی، پوسٹ کارڈ سائز کی فوٹو کاپیاں، چھوٹے چھوٹے الوداعی تحفوں کے ساتھ دیں۔ (تصویر کا نیگٹو کہیں گم ہو چکا تھا۔) لڑکے بڑے خوش ہوئے، کیوں کہ وہ سب کے سب اپنی اپنی تصویر گم کر چکے تھے۔ صرف تاکے ایچی کے پاس اُس کی کاپی اب تک محفوظ تھی۔

''اپنا خیال رکھنا،'' انھوں نے کہا۔ اور پھر دھیمی آواز میں اضافہ کیا: ''عزّت کی موت مرنے کی ضرورت نہیں۔ زندہ واپس آنا۔''

یہ بات سن کر لڑکے بالکل خاموش ہو گئے، جیسے اُن دنوں ہوا کرتے تھے جب کی یہ تصویر تھی۔ ایسو کیچی کی آنکھیں نم ہو گئیں لیکن یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہوئی۔ تاکے ایچی تعظیماً جھکا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ کیچی جی نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ تاداشی نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ صرف نیتا جواب میں بولا: ''بالکل ٹھیک مسز اوئیشی، میں فتح مند واپس آؤں گا۔'' نیتا کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا پُرسکون تھا۔ خاص طور پر ''واپس'' کا لفظ اس نے بڑی احتیاط سے ادا کیا تھا۔ وہ وقت آ چکا تھا جب سپاہیوں کو واپس آنے کے بارے میں سوچنا تک ترک کر دینا چاہیے تھا۔ کیا نیتا کا مطلب وہی ہے جو اس کے لفظوں سے ظاہر ہو رہا ہے؟ کسی کا دل رکھنا یا گول مول بات کہنا اُس کی صاف گوئی کی عادت کے برخلاف تھا۔ اسے بھی اپنی جان دینے میں اتنا ہی تذبذب محسوس ہوتا ہوگا جتنا کسی اَور کو۔ شاید وہی ایک تھا جس نے سب سے زیادہ صاف گوئی سے اپنے جذبات ظاہر کر دیے تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ چند روز پہلے جب جسمانی معائنے کے نتیجے میں اسے ''اے گریڈ'' قرار دیا گیا تو وہ سوچے بغیر، معائنہ کرنے والوں کے منہ پر زور سے کہہ اُٹھا تھا: ''لعنت ہو!'' وہاں موجود ہر شخص بے اختیار ہنس پڑا تھا اور دن بھر میں یہ بات سارے راس میں پھیل گئی تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ نیتا کو اس بات پر ایک تھپڑ تک نہ سہنا پڑا۔ اس کا اچانک چیخ پڑنا اس کے ممتحنوں کو ناگوار محسوس نہ ہوا کیوں کہ

یہ اس قدر خبطی پن کی بات معلوم ہوتی تھی۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اپنے اصل احساس کا اظہار کرنے میں کامیاب رہا۔ اس واقعے کی روداد، جس میں نیتا نے نہ صرف پانے بلکہ دوسروں کے بھی احساس کی ترجمانی کی تھی، ایک پُر لطف قصے کے طور پر مسز اوئیشی تک بھی پہنچ چکی تھی۔

کیا نیتا واقعی یہ سمجھتا ہے کہ وہ فتح مند لوٹے گا؟

کچھ بھی ہو، اگلے سال کا نصف سے زیادہ حصہ لڑکوں کی طرف سے کوئی اطلاع آئے بغیر گزر گیا۔ مڈوے کی لڑائی کی خبریں سن کر ساحلی گاؤں کے باشندے تشویش اور بے بسی کے احساس میں گھر گئے۔ کچھ مائیں اپنے بیٹوں کی سلامتی کی دعائیں مانگنے کی غرض سے مندروں کے زیادہ چکر کاٹنے لگیں۔

نیتا اور تاداشی کو نیوی میں بھرتی کیا گیا تھا۔ روانگی کے بعد سے جہازی نیتا کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی، نیتا جسے یاد کر کے ہر شخص مسکرا دیتا اگر حالات اتنے سنگین نہ ہوتے۔

''نیتا کی اوچنی پیاری آواز اس وقت کہاں گونج رہی ہوگی؟ مسز اوئیشی سوچا کرتیں۔

جب کبھی وہ اپنے سابق شاگردوں کا تصور کرتیں تو انھیں وہ تمام لڑکے یاد آتے جنہیں انھوں نے شہر ''ک'' کے بس اسٹاپ پر دیکھا تھا، وہ بڑے میاں بھی یاد آتے جن کی ہنسی سے ان کے منہ کے اندر کا خلا دکھائی دینے لگتا تھا، اور سڑک کے کنارے کیاریوں میں لگی زرد گلاب کی جھاڑیاں بھی جن میں لگی ہوئی کلیاں مارچ کے اُس سرد دن ''مفت'' ملنے والی دھوپ میں جھوم رہی تھیں۔ جس بات سے ان کے دل پر اَور زیادہ تاریکی چھا جاتی تھی وہ ان کے شوہر کی یاد تھی جن کے جہاز کو کچھ عرصہ پہلے فوجی ٹرانسپورٹ کے جہاز میں تبدیل کر لیا گیا تھا اور جو اَب خدا جانے کہاں سفر میں تھے۔ اس جنگ زدہ ملک کی بیویوں اور ماؤں کو اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ اپنی فکروں میں ایک دوسرے کو شریک کر لیں۔ کیسی احمقانہ بات تھی کہ انھیں محض اس لیے اس قابلِ رحم حالت سے گزرنا پڑتا تھا کہ بہت سی دوسری عورتیں بھی اسی مصیبت سے دوچار تھیں۔ وہ سب جنھیں اس بنا پر اپنے دکھ کی بات کرنے سے روک دیا گیا ہے کہ ان جیسی اَور عورتیں بھی اپنی مصیبت کو خاموشی سے جھیل رہی ہیں، اگر ایک ساتھ بول اٹھیں تو؟ مگر اوہ، یہ بھلا کیوں کر ممکن ہے؟ اگر ان میں سے

کوئی ایک عورت بھی بولنے کی جرأت کرے تو، جیسا کہ اُن بڑے میاں کا کہنا تھا، اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جائیں گے۔

سڑک کے کنارے لگی ہوئی زرد گلابوں کی کلیاں شاید اب تک کِھل چکی ہوں گی، مگر وہ لڑکے.....

MashalBooks.com

مسز روہانسو

اس روز اپریل ۱۹۴۶ کی چار تاریخ تھی۔ اس سے گزشتہ سال جنگ ختم ہو چکی تھی اور زمین اور آسمان کو اُس کی دہشت ناکیوں سے نجات مل گئی تھی۔ اس دن صبح سویرے صنوبر والے گاؤں سے ایک کشتی روانہ ہوئی۔ یہ کشتی راس کی جانب چلی، اس پر ایک دُبلی، پستہ قد، معمّر عورت سوار تھی جس نے گہرے نیلے رنگ کا لبادہ پہن رکھا تھا جس پر چھوٹے چھوٹے سفید خانے بنے ہوئے تھے۔

پُرسکون سمندر پر چھائے گہرے کُہرے میں راس کچھ ایسی دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی خواب میں تیر رہی ہو۔ لیکن کچھ دیر میں، اُبھرتے سورج کی روشنی سے، اس کی لمبی، نوک دار شکل کہرے سے یوں باہر آتی گئی جیسے نیند سے جاگ رہی ہو۔

''اوہ، دُھنداب چھٹنے لگی ہے،'' چپّو چلاتے ہوئے لڑکے نے کہا۔ وہ دس برس سے کچھ ہی بڑی عمر کا لگتا تھا۔ اپنے پورے ننھے سے بدن کا زور لگا کر کشتی کھیتے ہوئے، وہ اپنی چمکیلی آنکھوں سے راس کے گاؤں کو تک رہا تھا جو ابھی کافی دور تھا۔ عورت نے، جس کی نظریں بھی گاؤں پر جمی ہوئی تھیں، شفقت بھرے لہجے میں لڑکے کو مخاطب کیا۔

''تم اس گاؤں میں پہلی بار جا رہے ہو نا، دائے کیچی؟'' عورت کی آواز اس کی ظاہری عمر کو دیکھتے ہوئے جوان معلوم ہوتی تھی۔

''ہوں۔ مجھے کبھی وہاں جانا ہی نہیں پڑا،'' لڑکے نے منہ پھیرے بغیر جواب دیا۔

''ہاں، یہ تو ہے۔ میرا خود بھی بہت عرصے سے وہاں جانا نہیں ہوا۔ یہ جگہ اتنی الگ تھلگ ہے۔ اٹھارہ سال پہلے میں یہاں پڑھانے جاتی تھی۔ اُف! تقریباً دو دہائیاں گزر گئیں! ہاں، آخر اب میں بوڑھی بھی تو ہو گئی ہوں۔''

یہ مسز اوئیشی تھیں۔۔ اتنے برس بعد! آج، تیرہ سال بعد، وہ ایک بار پھر پڑھانا شروع کرنے والی تھیں، اور وہ بھی راس کے گاؤں میں۔ پہلے وہ کتنے جوش کے

ساتھ سائیکل پر سوار ہو کر وہاں جایا کرتی تھیں۔ کیا جوانی کا وہ جوش ختم ہو گیا؟ شاید ختم ہو گیا۔ لیکن صرف یہی سبب نہیں تھا کہ آج وہ کشتی میں بیٹھ کر جا رہی تھیں۔ جنگ نے لوگوں کو سائیکلوں سے محروم کر دیا تھا، یعنی روزمرہ ضرورت کی ایک چیز سے۔ جنگ ختم ہونے کے چھ ماہ بعد تک بھی سائیکل خریدنا ناممکن تھا۔ گاؤں میں دوبارہ تعینات ہونے پر مسز اوئیشی کو سب سے زیادہ پریشانی اسی بات کی تھی۔ گاؤں تک کا کچھ راستہ بس کے ذریعے طے کیا جا سکتا تھا، لیکن جنگ کے دوران اس راستے پر بسیں چلنی بھی بند ہو گئی تھیں اور اب تک دوبارہ شروع نہیں ہوئی تھیں۔ وہاں پہنچنے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا کہ پانچ میل کا راستہ، جسے مسز اوئیشی جوانی میں بھی سائیکل پر طے کرتی تھیں، پیدل طے کیا جائے۔ انھیں ڈر تھا کہ ان کی کمزور صحت یہ بوجھ برداشت نہیں کر پائے گی، اس لیے انھوں نے اپنے سب گھر والوں کے وہاں منتقل ہو جانے کی تجویز پیش کی۔ دائے کیچی نے اس پر فوراً اعتراض اٹھایا اور پیش کش کی کہ وہ ان کو ہر روز کشتی میں وہاں لے جانے اور واپس لانے کو تیار ہے۔ لیکن کشتی کرائے پر لینے کے لیے خاصی بڑی رقم درکار تھی۔

''اور بارش کے دنوں میں کیا کرو گے؟''

''میں ابّا کی برساتی پہن لیا کروں گا۔''

''اور جس دن تیز ہوا چل رہی ہو گی تب ہم کیا کریں گے؟''

دائے کیچی اس پر چپ رہا۔

''اچھا خیر، پریشان مت ہو۔ جس روز تیز ہوا چل رہی ہو گی، میں پیدل چلی جاؤں گی۔'' انھوں نے فوراً اپنے بیٹے کی جسے کوئی جواب نہیں سُوجھ رہا تھا۔ کل کی بات کل دیکھی جائے گی۔ ان طویل، دشوار برسوں نے، جب لوگ ایک ایک دن کر کے جینے پر مجبور تھے، ان کو کم سے کم اتنا سخت جان بنا دیا تھا کہ وہ خراب موسم جیسی چھوٹی موٹی دشواریوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ جنگ نے اوئیشی خاندان کے افراد کی تعداد کو چھ سے کم کر کے تین کر دیا تھا، جس کے باعث باقی ماندہ افراد کا زندہ رہ جانا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

دائے کیچی چھٹی کلاس میں پہنچ گیا تھا اور نامیکی چوتھی میں۔ نامیکی آج اپنی امّی کے پہلی بار پڑھائے جانے کے موقعے پر انہیں خدا حافظ کہنے کنارے تک آیا تھا۔ مسز اوئیشی کو اچانک یاد آیا کہ نامیکی کے اسکول جانے کا وقت ہو رہا ہے، اور انھوں نے گردن پھیر کر صنوبر کے پیڑ کی طرف دیکھا۔ سمندر کی جانب سے صنوبر کو دیکھنے کا موقع بہت طویل

عرصے بعد آیا تھا، لیکن اس منظر میں جب سے اب تک کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ باہر سے دیکھنے پر گاؤں بھی قطعی بدلہ ہوا نہیں لگتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ طویل جنگ کے بعد آنے والی شکست نے وہاں بڑی تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔

''دائے کیچی، تم تھک تو نہیں گئے؟ مجھے ڈر ہے کہ تمھارے ہاتھوں پر آبلے نہ پڑ جائیں۔''

''پڑ بھی گئے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ کوئی بڑی بات نہیں۔''

''تم واقعی بڑے باہمّت ہو۔ کل سے ذرا سویرے نکلا کریں؟''

''کیوں؟''

''استانی کے بیٹے کے لیے روز دیر سے اسکول پہنچنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس دوران مَیں سائیکل حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔''

''آپ فکر مت کیجیے۔ آپ کو چھوڑنے کی وجہ سے دیر ہوئی تو مجھے ڈانٹ نہیں پڑے گی۔ میں روز آپ کو چھوڑ آیا کروں گا۔'' لڑکا فخریہ انداز میں مسکرایا اور چپّوؤں کے سہارے خود کو ہلکے ہلکے جھولا جھلانے لگا۔

''تم کشتی کھینچنے میں بڑے ماہر ہو گئے ہو! سچ مچ سمندر کے بیٹے ہو۔ تم نے سیکھا کہاں سے؟''

''بس سیکھ لیا۔ چھٹی کلاس تک پہنچتے پہنچتے سب کو آ جاتا ہے۔''

''اچھا؟ پھر تو مجھے بھی سیکھ لینا چاہیے۔''

''نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کو لے جایا کروں گا۔''

''مجھے یاد آیا، ایک لڑکا تھا جس کا نام تاداشی موری او کا تھا۔ وہ پہلی کلاس میں تھا جب اس نے مجھے کشتی میں بٹھا کر لے جانے کی پیش کش کی تھی۔ بہت پہلے کی بات ہے۔۔۔ مگر وہ جنگ میں مارا گیا۔''

''اوہ! آپ کا شاگرد تھا؟''

''ہاں۔''

ایک دم مسز اوئیشی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو پورا مرد ہوتا، وہ سوچنے لگیں۔ انھیں وہ لمحہ یاد آیا جب وہ تاداشی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوئی تھیں۔۔ پانچ برس پہلے، بندرگاہ پر۔ اُس کی تصویر جوان کی یادداشت میں محفوظ تھی، اُبھر

کر سامنے آ گئی اور اُس کی بچپن کی تصویر سے مل گئی۔ یہ اس کی آخری جھلک تھی۔ اُن کے اَور کتنے شاگرد تھے جو اَب کبھی نظر نہ آنے کے لیے رخصت ہو چکے تھے؟ اُن کا دل یہ سوچ کر ڈوبنے لگا کہ اب، جب جاپان یہ ہولناک جنگ ہار چکا ہے، ان لڑکوں میں سے کتنے اپنے گاؤں لوٹ کر آئیں گے، کتنوں کی صورت وہ دوبارہ دیکھ سکیں گی۔

پچھلے پانچ برس کسی بھیانک خواب کی طرح گزرے تھے۔ یہ زمانہ ہر کسی کی طرح مسز اوئیشی نے بھی سخت مصیبت میں گزارا تھا، یہاں تک کہ وہ دوبارہ راس کے دور اُفتادہ گاؤں کے اسکول میں پڑھانے کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں اور آج اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں جا رہی تھیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار انھیں اپنی اس خوش نصیبی کا احساس ہو رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی ہُنر موجود ہے۔ انھیں ملازمت کی دوبارہ درخواست دینے کا مشورہ اُن کی سابق شاگرد سانائے نے دیا تھا۔ تب تک اُن کے حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ ان کے پاس اسکول پہن کر جانے کے لیے کوئی مناسب لباس بھی مشکل سے بچا تھا۔ سختی کا زمانہ لوگوں کو بہت تیزی سے بوڑھا کر دیتا ہے، اور مسز اوئیشی بھی گو ابھی چالیس سال کی تھیں مگر اس سے کہیں زیادہ عمر کی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک بار دیکھنے پر کوئی انھیں پچاس برس کا بھی سمجھ سکتا تھا۔

لوگ اپنے تمام انسانی حقوق قربان کر کے زندہ تھے اور مر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں یا تو خوف کے مارے پھٹی رہتیں یا وہ کنارے سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے انھیں بند کر لیتے۔ ہر روز وہ حالات کے دباؤ سے ہیجان میں رہا کرتے۔ اس سے بدتر بات یہ تھی کہ رفتہ رفتہ وہ اس صورتِ حال کے عادی ہو گئے اور جسمانی اور روحانی طور پر بالکل اکھڑ اور وحشی ہو گئے۔ اس رجحان کے خلاف بغاوت کا مطلب موت تھا۔ یہ ہیجانی حالت جنگ کے بعد بھی قائم رہی اور لوگوں کو اکثر احساس ہوتا کہ جنگ شاید ختم نہیں ہوئی ہے۔

اگست ۱۹۴۵ کی پندرہ تاریخ کو (تب تک لوگوں کو سنی سنائی باتوں سے ایٹم بم کی ظالمانہ تباہ کاری کا اندازہ سا ہو چکا تھا، لیکن انھیں اس کی ہلاکت خیزی کی پوری حقیقت سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا) دائے کیچی کو، جو اس وقت پانچویں کلاس میں تھا، شہنشاہ کی تقریر ریڈیو پر سننے کے لیے اسکول طلب کیا گیا۔ ہتھیار ڈالنے کا شاہی اعلان سننے کے بعد وہ دل شکستگی کی حالت میں گھر لوٹا۔ اس کا سر تھوڑا سا جھکا ہوا تھا جیسے اس نے شکست کی ذمے

داری اپنے ننھے کاندھوں پر لے رکھی ہو۔

تب سے اب تک چھ مہینے سے کچھ زیادہ وقت گزرا تھا۔ مسز اوئیشی اپنے بہادر ننھے بیٹے کو محنت اور مشاقی سے چپو چلاتے دیکھ کر متاثر ہو رہی تھیں۔ بچے وقت کی تبدیلیوں سے خود کو کتنی جلد مانوس کر لیتے ہیں۔ مسز اوئیشی جانتی تھیں کہ اگر وہ دائے کیچی کو یاد دلائیں کہ ابھی چھ مہینے پہلے، پچھلے اگست میں، اس کا طرزِ عمل کیسا تھا، تو وہ کس قدر شرمندہ ہوگا۔ سو انھوں نے اپنے خیال کو اپنے ہی تک رکھا۔

اُس روز انھوں نے اپنے دل گرفتہ بیٹے کی ہمّت بندھانے کے لیے چہرے پر ایک مسکراہٹ پیدا کر کے اسے اپنے بازوؤں میں لیا تھا۔ ''تم اتنے اُداس کیوں ہو؟'' انھوں نے کہا تھا۔'' اب آئندہ سے تم اس طرح پڑھ سکو گے جیسے بچوں کو پڑھنا چاہیے۔ آؤ، اب کھانا کھالو۔''

دائے کیچی کھانے کے وقت بہت جوش دکھاتا تھا، مگر اُس روز اس نے کھانے کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ''امّی، ہم جنگ ہار گئے ہیں۔ آپ نے ریڈیو پر نہیں سنا؟'' اس کی آواز آنسوؤں سے رُندھی ہوئی تھی۔

''سن لیا ہے۔ بہر حال، جنگ ختم تو ہوگئی۔ یہ اچھی بات نہیں ہے؟''

''چاہے ہم ہار گئے ہوں؟''

''ہاں۔ دیکھو، اب کوئی شخص لڑائی میں مارا نہیں جائے گا۔ اور جو زندہ بچے ہیں وہ لوٹ آئیں گے۔''

''ہم نے آخری سانس تک جنگ کے مقولے پر عمل نہیں کیا۔''

''اچھا ہوا نہیں کیا۔''

''کیا آپ ہارنے پر روئیں گی بھی نہیں؟''

''نہیں۔''

''کیا آپ کو خوشی ہو رہی ہے؟'' دائے کیچی نے ملامت آمیز لہجے میں پوچھا۔

''احمق مت بنو، دائے کیچی۔ اپنے بارے میں سوچو۔ تمھارے ابّا مارے گئے، مارے گئے نا؟ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے، دائے کیچی۔''

لڑکا اُن کی درشت آواز پر چونک اٹھا اور ان کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے پہلے بار نیند سے جاگا ہو۔ مگر اس کے ذہن کی آنکھ اب بھی پوری طرح کھُلی نہ تھی۔

MashalBooks.com

اس نے اپنی ماں کو اس بات پر طعنہ دینا چاہا کہ وہ اس المناک لمحے میں بھی کھانا کھانے کی بات کر رہی ہے۔ اس لڑکے کو امن کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کی پیدائش بھی ہوائی حملے کی مشق کے دوران ایک اندھیری رات میں ہوئی تھی۔ وہ بلیک آؤٹ میں بڑا ہوا تھا، سائرن کی چیخیں سننے کا عادی ہو گیا تھا، اور اسکول جاتے ہوئے گرمیوں میں بھی، اپنے سر پر حفاظتی خود چڑھائے رکھتا تھا کہ ہوائی حملے کی صورت میں سر پر چوٹ نہ آئے۔ ان حالات میں بڑے ہونے کے باعث وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کی ماں جنگ سے اس قدر نالاں کیوں ہے۔ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی جنگ پر گیا تھا، اور گاؤں میں کوئی جوان لڑکا مشکل ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ دائے کیچی کو یہ بات عجیب معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تمام مندروں کے احاطوں سے سبزہ بالکل صاف کر دیا گیا تھا اور وہاں گرا ہوا ایک پتّا تک نظر نہ آتا تھا۔ ''یہ ہمارا رہن سہن کا طریقہ ہے،'' دائے کیچی یہی سمجھتا تھا۔ واحد چیز جو اسے سخت ناگوار تھی وہ کسیلی روٹی تھی جو بلوط کے ان دانوں سے بنائی جاتی تھی جنھیں وہ خود جنگل سے بین کر لاتا تھا۔

جنگ کے دوران دائے کیچی کے چھوٹے سے گاؤں کے کئی نو عمر لڑکے رضا کارانہ طور پر نوجوانوں کے ہوئی دستوں میں شامل ہوئے تھے۔ ''ہوائی دستے میں کام کرنے والے جی بھر کے زینزائی کھا سکتے ہیں،'' یہ وہ الفاظ تھے جو فوج غریب لڑکوں اور ضرورت مند خاندانوں کے بیٹوں کو ہوئی دستوں میں بھرتی کی ترغیب دینے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ مگر یہ لڑکے بہت جلد ہیرو بھی بن جاتے تھے۔ ہوتے ہوتے وہ وقت آ گیا جب ''مقصد'' کے لیے قربانی دینے سے ہچکچانے والا ہر خاندان، چاہے امیر ہو یا غریب، وطن کا غدّار کہلایا جانے لگا۔ اگر یہ لڑکے اپنی پڑھائی ترک کر کے، اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر فوجی خدمت میں شامل ہوتے تو اُن کی اَور بھی زیادہ تعریف کی جاتی، اور اگر وہ اپنے گھر کے اکلوتے ہوتے تو اس سے بھی زیادہ۔ ایک بار جب قصبے کے جونیئر اسکول میں بہت سے لڑکے رضا کاروں کے طور پر بھرتی ہوئے تو ان میں سے تین اکلوتے لڑکے تھے جنھوں نے اپنے ماں باپ سے اجازت نہیں لی تھی۔ اس بات کو، والدین کی دشہت زدگی کا خیال کیے بغیر اسکول کے لیے ایک بڑا اعزاز قرار دیا گیا۔ دائے کیچی نے، جو اُس وقت بہت کم سِن تھا، یہ بات سن کر بڑی حسرت سے کہا تھا: ''کاش میں بھی جونیئر اسکول میں ہوتا۔'' پھر وہ گانے لگا:

''بحریہ کے افسروں کے کوٹ میں
سات بٹنوں کی قطار
اوران بٹنوں پہ کندہ
جہازوں کےلنگراور چیری کے پھول۔۔۔''

انسانی جانوں کو چیری کے پھولوں سے تشبیہ دی جاتی تھی اور بچوں کو سکھایا جاتا تھا کہ نوعمرلڑکوں کی زندگی کا عظیم ترین مقصداوراعلیٰ ترین اعزاز یہ ہے کہ وہ لڑتے ہوئے مارے جائیں۔ تعلیم بہرحال اس غرض سے جاری رکھی گئی کہ جاپان بھر کےلڑکوں کے ذہنوں میں یہ ایک خیال راسخ کیا جائے۔ سخت کوشی اور محنت کی علامت کنجیر وِنینو مِیا کے مجسمے اسکولوں کے میدانوں سے ہٹا دیے گئے اور تالیوں کی گونج میں انھیں دھات کے ٹکڑوں کے طور پر چندے میں دے دیا گیا۔ مندروں کی گھنٹیاں، جوصدیوں سے ہر صبح اور ہر شام وقت کے گزرنے کا اور موسمی خطروں کے موقعوں پر خبردار رہنے کا اعلان کیا کرتی تھیں، بُرجوں پر سے اتار کر پگھلا ڈالی گئیں۔ ایسے ماحول میں یہ بات کم وبیش فطری ہی تھی کہ دائے کیچی جیسےلڑکے ہیرو بننے کا خواب دیکھنے لگے اور انھوں نے اپنی زندگیوں کی قدر کرنا ترک کر دیا۔ مگر یہ ایک ایسا رجحان تھا جس کے سامنے اس کی ماں نے کبھی سپر نہیں ڈالی۔

''سنو، دائے کیچی،'' وہ ایسے موقعوں پر کہا کرتیں۔ ''میں چاہتی ہوں تم بڑے ہوکر ایک شہری بنو۔ ہمارے گھر کا ایک فرد پہلے ہی عزّت کی موت مر چکا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ مرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی پوری جان لگا کر تمھیں بڑا کیا ہے اور تم اپنی جان دے دینا چاہتے ہو؟ کیا تمھیں اس پر افسوس نہیں ہوگا کہ میری باقی زندگی روتے ہوئے گزر جائے؟'' مسز اوئیشی نے یہ بات یوں کہی جیسے دائے کیچی کے جلتے ہوئے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ رہی ہوں، مگر وہ اس قدر جوش میں تھا کہ اس خفیف لمس کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس وہ اپنی ماں سے بحث میں الجھ پڑا۔ بولا: ''اس کے بغیر آپ کوشہید کی ماں بننے کا اعزاز کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟'' لگتا تھا اُسے پوری طرح یقین ہو چکا ہے کہ لڑتے ہوئے مارا جانا ہی اپنے والدین اور شہنشاہ سے وفاداری کا بہترین اظہار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ماں اور بیٹے کے لیے ہم خیال ہونا ناممکن ہوگیا تھا۔

''میرے خدا!'' ماں نے کہا۔ کیا تم مجھے شہید کی ماں بنانے پر بھی تُلے ہوئے ہو؟ میں اپنے شوہر سے محروم ہو چکی ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

دوسری طرف بیٹا اپنی ماں کے ان خیالات پر دل میں شرمندہ تھا۔ ایک جنگ جُو قوم میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسے اپنی عزّت کا فطری طور پر بہت خیال رہتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے احساسات کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرتا تھا۔ اسے خود مسز اوئیشی کے لفظوں اور طرزِ عمل پر تشویش ہوتی تھی۔ اسے بہت دن پہلے کا ایک واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔

اُس موقعے پر دائے کیچی کے ابّا بیماری کی چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے کہ انھیں ڈیوٹی پر واپس پہنچنے کے احکام ملے۔ سب سے پہلے دائے کیچی اس خبر پر جوش میں آ گیا اور پھر اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کے ساتھ مل کر شور مچانے لگا۔ اس کی امّی تیوری پر بل ڈال کر دبی ہوئی آواز میں بولیں: ''اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے؟ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا؟ یہ نہیں جانتا کہ میرے لیے اس بات کا کیا مطلب ہے۔'' ان لفظوں کے ساتھ انھوں نے اس کی پیشانی پر انگلی رکھ کر ہلکا سا دھکا دیا۔ دائے کیچی اپنا توازن کھو کر پیچھے گرتے گرتے بچا۔ پھر غصے سے اُچھل کر اپنی ماں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مگر جب اس نے اپنی ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری دیکھیں تو گھبرا کر رک گیا۔ اس کے ابّا نے مسکراتے ہوئے اسے دلاسا دیا: ''کوئی بات نہیں، دائے کیچی۔ تمھاری عمر کے لڑکوں کو ایسا ہی پُر جوش ہونا چاہیے۔ اگر تم جذباتی ہوتے تو میں کیا کرتا؟ ٹھیک ہے، تم جتنا جی چاہے شور مچاؤ۔''

مگر اب دائے کیچی کا جی شور مچانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر ابّا نے تینوں بچوں کو بازوؤں میں گھر کر سینے سے لگا لیا۔ ''صحت مند رہو اور جلدی سے بڑے ہو جاؤ،'' وہ بولے۔ ''تمھیں بڑے ہو کر اپنی ماں اور نانی کا اچھی طرح خیال رکھنا ہے۔ اس وقت تک جنگ ختم ہو چکی ہو گی۔''

''اچھا؟ آپ کو کیسے پتا؟''

''ایسا نہ ہوتا تو مجھ جیسے بیمار آدمی کو بلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔''

اُن کی بات بچوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ انھیں صرف اس بات پر فخر محسوس ہوتا رہا کہ ان کے ابّا دوسرے مردوں کی طرح جنگ پر جا رہے تھے۔ اُس سے پہلے تک وہ شرمندہ تھے کیوں کہ انکے گھر کے سب افراد گھر پر ہی مقیم تھے۔ جاپان بھر میں خاندانی زندگی اس حد

تک انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔

سائی پان کے سقط سے کچھ پہلے کی بات ہے کہ دائے کیچی کے خاندان کو اس کے ابّا کی موت کی اطلاع سرکاری نوٹس کے ذریعے ملی۔ تب دائے کیچی بھی روئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی کہنی سینے میں گڑائے وہ کلائی سے آنکھوں کے آنسو پونچھتا رہا۔ اُس کی امّی نے اس کے کاندھے پکڑ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ ''مایوس مت ہو، دائے کیچی۔ مرد بنو!'' انھوں نے دائے کیچی کو اور خود کو دلاسا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دھیمی آواز میں اسے بتانے لگیں کہ اس کے ابّا کو گھر پر رکے رہنے کی کتنی شدید خواہش تھی۔ ''وہ جانتے تھے کہ ایک بار رخصت ہو کر وہ پھر کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اور تم لوگ تھے کہ مارے جوش کے اُچھلے پڑ رہے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں سوچ سوچ کر اس قدر دکھ ہو رہا تھا۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔۔۔''

مگر ایسے وقت میں بھی دائے کیچی کو تعجّب ہو رہا تھا کہ اس کی امّی ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی امّی جنگ پر جاتے ہوئے ابا کے جوش و خروش کا ذکر کرتیں۔ ابّا کی جان جانے کا تو کچھ اسے بھی افسوس تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی تقدیر کو حالات کا فطری نتیجہ سمجھ کر صبر کر لیا تھا کیوں کہ ارد گرد کتنے ہی ایسے بچے موجود تھے جن کے باپ جنگ میں مارے گئے تھے۔ بلکہ پاس کے گاؤں میں تو ایک ایسا خاندان بھی تھا جس کے چاروں بیٹے جنگ کی نذر ہو گئے تھے۔ ان کے مکان کے صدر دروازے پر چار اعزازی تمغے برابر آویزاں تھے۔ دائے کیچی اس خاندان کو کس قدر عقیدت اور تحسین کی نظر سے دیکھا کرتا تھا! اسے تو بلکہ ان لوگوں پر رشک بھی محسوس ہوتا۔

کچھ ہی دنوں میں ایک چھوٹا سا مستطیل تمغا، جس پر ''عزّت کی موت'' کے الفاظ اُبھرے ہوئے درج تھے، دائے کیچی کے گھر بھی بھیجا گیا۔ اس کی امّی نے لفافے کو اپنی ہتھیلی میں اُلٹ کر خالی کر لیا اور نظر جما کر تمغے اور اس کے ساتھ آنے والے دو چھوٹے ناخنوں کو دیکھتی رہیں۔ پھر انھوں نے ان سب چیزوں کو دوبارہ لفافے میں ڈال دیا اور لفافے کو میز کی دراز میں رکھ دیا۔

''ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے اسے اپنے دروازے پر ٹانگنے کی۔ کیا بے وقوفی کی بات ہے!'' وہ غصّے میں بڑبڑائیں اور بیئر کی خالی بوتل میں چاول ڈال کر پھٹکنے لگیں۔ یہ چاول بچوں کے لیے نہیں بلکہ ان کی نانی کے لیے تھے جو بستر پر بیمار پڑی تھیں اور پتلے

چاولوں کے سوا کچھ نہ کھا سکتی تھیں۔ ہوائی حملے کی ایک مشق کے دوران گر پڑنے کے بعد سے وہ بستر سے اٹھ نہیں سکی تھیں اور ان کے دوبارہ صحتیاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ ڈاکٹر کی رائے تھی کہ وہ گرنے کی وجہ سے بیمار نہیں ہوئیں بلکہ پہلے سے بیمار تھیں اس لیے گر پڑی تھیں۔ گاؤں کا ڈاکٹر اسی برس سے زیادہ عمر کا ایک بوڑھا شخص تھا جس کے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ اسے کسی ایسے مریض کو دیکھنے جانے میں بڑی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی جس کی صحت یابی کی امید ختم ہو چکی ہو۔ بدقسمتی سے کوئی اَور ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ علاج سے مایوس ہو کر مسز اوئیشی اپنی امّاں کے لیے کم سے کم کھانے کی کوئی اچھی چیز حاصل کرنے کی کوشش کرتیں مگر یہ کام بھی آسان نہ تھا۔ سمندر کے بالکل پاس رہتے ہوئے بھی مچھلی خریدنا نہایت دشوار تھا۔ وہ مچھلی اور انڈوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکا کرتیں مگر بار بار تعظیماً جھکنے کی ذلّت اٹھائے بغیر کوئی ذرا سی چیز بھی حاصل کرنا ناممکن تھا۔ پھر بھی وہ اپنی کوشش جاری رکھتیں۔

ایک دن انھوں نے اعزازی تمغے کو اپنے مکان کے دروازے پر کیل سے لگا ہوا پایا۔ غالباً ان کی غیر موجودگی میں دائے کیچی نے دراز سے تمغہ نکال کر دروازے پر لگا دیا تھا۔ چھوٹا سا تمغہ، اپنی موزوں جگہ پر آویزاں، دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ''معزز'' بیوہ کچھ دیر وہیں کھڑی تمغے کو تکتی رہی: ''عزّت'' کی یہ چھوٹی سی علامت ایک آدمی کی جان کا بدل تھی! اعزار کے یہ تمغے نہایت بے شرمی کے ساتھ اپنی تعداد بڑھاتے اور ایک کے بعد ایک گھر کے دروازے کو آرائش دیتے جا رہے تھے۔ چھوٹے بچے ان کے سب سے بڑھ کر دل دادہ تھے۔

آخر پندرہ اگست کا دن آ گیا۔ پورے ملک پر ایک انتشار سا چھا گیا جیسے سب کچھ گدلے پانی کے بہاؤ میں غرق ہو گیا ہو۔ اگر اس انتشار کے بیچوں بیچ دائے کیچی جیسے بچوں کی آنکھیں رفتہ رفتہ کھُل رہی تھیں تو یہ ایسی بات نہ تھی جس پر ہنسا جائے۔ ان کا مضحکہ اڑانے کی قطعی کوئی وجہ نہ تھی۔

جنگ کے فوراً بعد کی بدانتظامی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے لوگوں نے خوب پیسا کمایا، اور جنگ میں ہلاک ہونے سے بچ جانے والے سپاہی ہر روز گھر لوٹنے لگے۔ کچھ سپاہی زندہ رہ جانے کے باوجود گھر لوٹنے سے معذور تھے، اور بہت سے باپ، شوہر، بیٹے اور بھائی اپنی جان دے چکے تھے اور ان کے گھر لوٹنے کا سوال ہی نہ تھا۔ ان

مرنے والوں کے اعزازی تمغے، جو دروازوں پر آویزاں تھے، ایک دم غائیب ہو گئے، جیسے انھیں ہٹا کر گھر والے اپنے احساسِ جرم کو نظروں کے سامنے سے غائب کر دینا چاہتے ہوں۔

دائے کیچی کے مکان کے دروازے سے بھی تمغا ہٹا لیا گیا، مگر اس کے بعد اسے اپنی بہن یاتسو کی اچانک موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کی نانی کی موت کو ابھی سال بھر بھی نہ گزرا تھا۔ چھوٹی بچی کا جاتے رہنا اتنے کم عرصے میں اس گھر میں تیسری موت تھی۔ دائے کیچی کا باپ سمندر کی اُبلتی لہروں میں گم ہو گیا تھا، نانی بیماری کے باعث سوکھتی چلی گئی تھیں اور ایک روز مرے ہوئے پیڑ کی طرح زمین پر آ گری تھیں، اور اب یاتسو بالکل کسی خواب کی طرح غائب ہو گئی، حالاں کہ موت سے ایک دن پہلے تک وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ان تینوں میں سے یاتسو کی موت نے گھر والوں کو سب سے زیادہ دکھ پہنچایا۔ اس نے چوری چھپے کچے پرسیمن کھا لیے تھے اور آنتوں میں شدید درد سے مر گئی تھی۔ یہ پرسیمن ایک مہینے میں پک جانے والے تھے لیکن اس نے انتظار نہیں کیا کیوں کہ کچے ہونے کے باوجود ان کا کسیلا پن دور ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ کئی اَور بچوں نے بھی کچے پرسیمن کھائے تھے، لیکن ان میں سے صرف ماتسو ہی مری۔

''جنگ ختم ہو گئی ہے، لیکن یاتسو بھی جنگ ہی کی وجہ سے مری۔'' جب دائے کیچی کی امّی نے یہ بات کہی تو وہ اس کا مطلب فوری طور پر نہ سمجھ سکا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ کافی عرصے سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ پرسیمن پکنے تک پیڑوں پر لگے نہیں رہنے دیے جاتے تھے کیوں کہ انتظار کا صبر لوگوں سے رخصت ہو چکا تھا۔ بچے ہمیشہ باہر نکل جاتے اور بھوک سے بے تاب ہو کر کوئی بھی اُگی ہوئی چیز کھا لیتے۔ وہ میٹھے آلوؤں کو، ان پر لگی ہوئی مٹی سمیت، کچا کھا جاتے۔ سب کے پیٹ میں کیڑے ہو گئے تھے۔ جس کے اثرات ان کی جلد پر دکھائی دینے لگے تھے۔ مگر بیمار پڑ جانے والے دیہاتیوں کے لیے کوئی ڈاکٹر موجود نہ تھا اور نہ دوائیں تھیں۔ ڈاکٹروں اور دواؤں دونوں کو جنگی خدمت کے لیے طلب کر لیا گیا تھا۔ جب نانی کا انتقال ہوا، اس وقت گاؤں کا مَہنت تک بھرتی ہو کر جا چکا تھا۔ پاس کے گاؤں کا مَہنت جنگ میں مارے ہونے سے ذرا پہلے واپس لوٹا اور آتے ہی اوئیشی گھرانے کے پاس پہنچا تا کہ مرنے والی کی یاد میں تعزیتی ترتیب منعقد کی جا سکے۔ گھر والوں کو گمان تک نہ تھا کہ بہت جلد انھیں یاتسو

کی آخری رسوم ادا کرنے کے لیے مہنت کو دوبارہ بلوانا پڑے گا۔

نانی کو مرنے سے پہلے گاؤں کے ڈاکٹر کی عدم موجودگی کا بہت قلق تھا۔ لیکن، دائے کیچی نے سوچا، بے چاری یاتسو کے ذہن میں غالباً ایسا کوئی خیال نہیں آیا ہوگا۔ اسے مہنت سے کدورت سی محسوس ہونے لگی جو زور زور سے مذہبی عبارت پڑھ رہا تھا۔ امّی نے بتایا تھا کہ جب یاتسو پیدا ہوئی، اُس وقت ابّا کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور وہ جہازی کی ملازمت چھوڑنے کی سوچنے لگے تھے۔ ابّا برسوں سے دنیا کے ساتوں سمندروں میں گھوم رہے تھے اور اب آخر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر پر رہ کر آرام کر سکیں۔ انھوں نے اپنے گھر کو آٹھویں سمندر کی بندرگاہ سے تشبیہہ دی اور نومولود بچی کا نام ''یاتسو'' یعنی آٹھواں ساحل رکھا۔ مگر وہ بہت بیمار ہو گئے تھے اور انھیں گھر لوٹ کر آرام کرنے کا موقع نہ ملا۔ اور اب یاتسو بھی، جس سے ابّا کی ساری امیدیں وابستہ تھیں، رخصت ہو گئی تھی۔

ہر چیز کو قلّت تھی اس لیے مسز اوئیشی کو یاتسو کا تابوت بنوانے کے لیے لکڑی خود فراہم کرنی پڑی۔ انھوں نے ایک پُرانی شکستہ الماری کی لکڑی تابوت کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ باغوں سے پھول بھی رخصت ہو گئے تھے، اس لیے دائے کیچی اور نامیکی نے قرستان میں اُگے ہوئے کچھ پھول چنے کہ مرنے والی بہن کے تابوت پر ڈالے جا سکیں۔

دونوں لڑکوں نے سنا تھا کہ بہت پہلے ان کے باغ میں بہت سے پھول، اگائے جاتے تھے۔ لیکن جہاں تک ان کی یادداشت کام کرتی تھی، انھوں نے اس باغ میں مولیاں اور لوکیاں ہی اگتی دیکھی تھیں۔ سائبان کے نیچے کے چھوٹے سے کچے قطعے میں بھی لوکیاں اگائی جاتی تھیں اور ان کی بیلیں چھت تک چڑھی ہوئی تھیں۔ یاتسو کی موت کے فوراً بعد، اس کی امّی نے روتے ہوئے ان بیلوں کو سائبان سے اتار لیا تھا۔ تین یا چار بظاہر بے مزہ لوکیاں بیلوں کے ساتھ لڑھکتی ہوئی نیچے آ گری تھیں۔ ان میں سے سب سے کم بد ہیئت لوکی مسز اوئیشی نے جنازے کے چڑھاوے کے لیے چنی۔ افواہ پھیل گئی تھی کہ بچی پیچش سے مری ہے، اس لیے مرنے والی کے سرھانے گھر والوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ شام کو جب معمول کے مطابق بجلی کی فراہمی میں وقفہ ختم ہوا تو مسز اوئیشی نے سولنگن کا بنا ہوا چاقو اٹھا لیا جیسے انھیں اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو، اور اسے اٹھا کر لوکی میں پہلو کی طرف سے اتار دیا جس پر ان کے دونوں بیٹے بہت حیران ہوئے۔ یہ وہ چاقو تھا جو ان کے ابّا لائے

تھے۔ بچوں کو بار بار تاکید کی گئی تھی کہ یہ چاقو بہت تیز اور خطرناک ہے۔ اگر اسے استعمال کرتے ہوئے ان کی امّی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ ہوتی تو وہ خوف کے مارے چلّا اٹھتے۔ اگرچہ وہ اپنی رونے سے سُوجی ہوئی آنکھوں کے باعث اجنبی سی لگ رہی تھیں لیکن ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر لڑکوں کو اطمینان ہو گیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

''آؤ، یاتسو کے لیے کوئی اچھی سی چیز بنائیں،'' امی نے کہا۔ ''مگر تمھیں کیا پتا ہوگا کہ یہ اچھی سی چیز کیا ہوگی۔ یاتسو نے بھی کبھی نہیں دیکھی۔ تم تو یہی سمجھتے ہو گے کہ ساری لوکیاں، چاہے مزے کی ہوں یا بے مزہ، کھانے ہی کے لیے ہوتی ہیں، ہے نا؟ پتا ہے، جب میں بچی تھی تو بے مزہ لوکیاں مجھے کھیلنے کے لیے دے دی جاتی تھیں۔ دیکھو، یہ بن گئی ایک کھڑکی۔'' انھوں نے لوکی میں پہلو کی طرف چاقو سے ایک چوکور سوراخ بنا دیا۔ ''اور اس طرف میں ایک گول کھڑکی بناؤں گی،'' وہ کہتی رہیں۔ ''یہ کھڑکی ذرا مشکل سے بنے گی۔ دائے کیچی، ذرا مجھے باورچی خانے سے چھوٹی طشتری لا دو۔ اس سے دائرہ ٹھیک بن جائے گا۔ اور ایک بڑی ٹرے بھی لے آنا۔ گودا اس میں ڈال دیں گے۔''

لڑکے حیرت سے پھیلی آنکھوں سے انھیں دیکھتے رہے۔ ان کی بنائی ہوئی چیز دراصل ایک لالٹین تھی۔ کھڑکیوں کو کاغذ سے ڈھانپ دیا گیا اور لوکی کے پیندے میں موم بتی ٹکانے کے لیے ایک کیل ٹھونک دی گئی۔ راشن میں ملنے والی موم بتی کو اندر جلا دینے کے بعد لالٹین ایسی بن گئی کہ یاتسو کو یقیناً پسند آتی۔ دائے کیچی ذرا دیر کو اپنا دکھ بھول گیا اور بولا: ''امّی، آپ تو بڑی اچھی کاریگر ہیں۔''

جب چھوٹا سا تابوت تیار ہو گیا تو اس لالٹین کو اس کے اندر ننھی بچی کے چہرے کے بالکل پاس رکھ دیا گیا۔ سیپیاں اور کاغذی گڑیاں بھی، جن سے یاتسو کھیلا کرتی تھی، اندر رکھ دی گئیں۔ اس کے دونوں بھائی اچانک دکھ سے بے اختیار ہو کر رونے لگے۔ دائے کیچی کو سسکیاں لیتے ہوئے اپنا کھیلنے کا رنگ یاد آیا جس لینے کا یاتسو کو ہمیشہ شوق رہا تھا۔ اس نے یہ رنگ کبھی اُس کے حوالے نہ کرنے پر خود کو ملامت کی اور اب اس کی تلافی کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے یہ رنگ یاتسو کے ہاتھوں میں تھمانے کی کوشش کی جو سینے پر بندھے ہوئے تھے لیکن اس کی سرد انگلیاں اب اسے تھامنے کو تیار نہ تھیں۔ رِنگ پھسل گیا اور تابوت کے فرش پر جا گرا۔ نامیکی بھی روتے ہوئے اپنے رنگ دار کاغذ لے آیا جو وہ یاتسو کی نظروں سے بچا کر اور بہت سنبھال کر رکھتا تھا۔ اس نے ان کاغذوں کو موڑ موڑ کر

چڑیاں، سپاہی اور غبارے بنائے اور تابوت میں رکھ دیے۔ ان سارے تحفوں کے ساتھ یاتسو اگلے جہان کو روانہ ہوئی۔

یاتسو کی موت کے بعد مسز اوئیشی اچانک عمر رسیدہ دکھائی دینے لگیں۔ وہ اپنے قد سے بھی چھوٹی معلوم ہونے لگیں اور ان کا وزن گھٹ گیا۔ جب وہ جھکتیں تو بالکل اپنی مرحوم امّاں جیسی نظر آئیں۔ دائے کیچی چھوٹا سا بچہ تھا لیکن اپنی ماں کو یوں تیزی سے بوڑھا ہوتے دیکھ کر سُن رہ گیا۔ اسے خوف ہونے لگا کہ اب کہیں انھیں کچھ نہ ہو جائے۔ وہ اتنا سمجھ دار ضرور ہو گیا تھا کہ انسانی جان کی اہمیت کو محسوس کر سکے۔ ''اپنی امّی کا اچھی طرح خیال رکھنا،'' اس کے ابّا کے کہے ہوئے یہ الفاظ اب اس کے لیے بامعنی ہو گئے تھے۔

وہ کہتا: ''امّی، جنگل سے لکڑی مَیں لے آؤں گا،'' اور نامیکی کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل دیتا۔

''میں اسکول سے لوٹتے ہوئے راشن لے آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے راشن کی دور دراز دکان سے سامان لانے کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔

نامیکی بھی، جہاں تک اس سے ممکن تھا، مدد کیا کرتا۔ ''امی، آپ کو جتنا پانی چاہیے میں نکال دوں،'' وہ کہتا۔ ان کی امّی، جن کی آنکھیں اب پہلے کی نسبت زیادہ آسانی سے نم ہو جایا کرتی تھیں، دھیمی آواز میں کہتیں: ''واہ! تم دونوں تو اچانک بڑے اچھے بچے ہو گئے ہو!''

مسز اوئیشی کو، جو اب بہت کم زور ہو گئی تھیں اور جنھیں کسی دیکھ بھال کرنے والی کی ضرورت رہنے لگی تھی، سانائے کی پس پردہ کوششوں سے پڑھانے کا کام دوبارہ مل گیا۔ سانائے اب بڑے اسکول میں استانی تھی۔

''ان کی عمر چالیس سال ہے نا؟ اس عمر میں تو استانیاں ریٹائر ہو جاتی ہیں۔'' پرنسپل نے پہلے تو ہچکچاہٹ دکھائی۔ مگر سانائے نے اپنا اصرار مسلسل جاری رکھا اور آخر وہ اس شرط پر راضی ہو گئے کہ مسز اوئیشی کو راس کے گاؤں میں پڑھانا ہو گا، اور وہاں بھی ان کو اپنی تعلیمی قابلیت کے مطابق باقاعدہ استانی کی نہیں بلکہ عارضی استانی کی ملازمت ملے گی جو مکمل طور پر پرنسپل کے اختیار میں ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی متبادل ملنے کی صورت میں ان کی ملازمت کسی بھی وقت ختم کی جا سکتی تھی۔ ہمدردی سے مغلوب ہو کر سانائے نے مسز اوئیشی کو یہ اطلاع دی۔ اس کی بات سن کر مسز اوئیشی کی آنکھیں عجیب

انداز سے جھلملانے لگیں۔

''میں بس اتنا ہی چاہتی ہوں۔ دیکھو نا، میں نے اس گاؤں میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ وعدہ مجھ پر ایک طرح سے قرض ہے۔'' انھوں نے پرنسپل کی شرط کا بھی برا نہیں مانا اور یوں مسکرانے لگیں جیسے ان کے دل سے خوشی کے دھارے پھوٹ رہے ہوں۔ ٹھیک اسی لمحے وہ الفاظ بھی، جو ان کی یادداشت سے مٹنے لگے تھے، کھلتے ہوئے پھولوں کی سی تازگی کے ساتھ انھیں دوبارہ یاد آنے لگے۔

''استانی صاحبہ، دوبارہ ضرور آیئے گا۔''

''جب آپ کا پیر ٹھیک ہو جائے تو دوبارہ آیئے گا۔''

''ضرور آؤں گی، وعدہ رہا۔''

کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان پر ''بوڑھی'' مسز گروتو کی طرح ترس کھایا جا رہا ہے، انھیں مسز گروتو کی طرح جنھوں نے کبھی ان کی جگہ لی تھی؟ بے شک، وہ یہ بات جانتی تھیں۔ لیکن دو بچوں کی بیوہ ماں ہوتے ہوئے انھوں نے مسز گروتو کی طرح گاؤں کے اسکول میں جانا خوشی سے قبول کر لیا۔

جب انھوں نے رات کی تر و تازہ ہوا میں بھیگی، راس کی سرسبز پہاڑیوں کو اپنے نزدیک آتے دیکھا تو انھیں خود اپنے میں بھی جوانی کی تازگی محسوس ہوئی۔ پُرانے دنوں میں وہ اپنے مغربی لباس اور سائیکل کے ساتھ اپنے وقت سے آگے رہی تھیں۔ اب ان کے کھچڑی بال سادہ نمونے میں پیچھے کو بندھے ہوئے تھے، وہ اپنے مرحوم شوہر کے پرانے گہرے نیلے کیمونو سے بنایا ہوا لباس پہنے تھیں، اور ان کا بیٹا کشتی کھے کر انھیں گاؤں کی طرف لیے جا رہا تھا۔ اگر کوئی چیز ان کی پچھلی شخصیت کی یاد دلاتی تھی تو وہ تھیں ان کی آنکھیں، جو اچانک چمک اٹھی تھیں، اور ان کی پُر شباب آواز۔

ایک زمانہ تھا کہ انکے مغربی لباس اور سائیکل کو ضرورت سے زیادہ ماڈرن قرار دیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود یہ چیزیں رفتہ رفتہ رواج پا گئیں۔ چنانچہ اب راس کے گاؤں میں مشکل ہی سے کوئی ایسی عورت ہوگی جو سائیکل چلانا نہ جانتی ہو۔ مگر اب، تقریباً بیس برس بعد، کسی کو یاد نہ تھا کہ مسز اوئیشی اپنی نوعمری میں کیسی دکھائی دیتی تھیں۔

زمین گویا سرکتی ہوئی ان کے نزدیک آتی جا رہی تھی، اور کشتی اب ساحل کے بالکل پاس پہنچ گئی تھی۔ بالکل جیسے پرانے دنوں میں ہوتا تھا، گاؤں کے بچے دائے کیچی کو

ایک بانس کی مدد سے کشتی کو گودی میں لاتے اور اس میں ایک نامانوس عورت کو بیٹھے دیکھ کر ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو گئے تھے۔ مسز اوئیشی ان میں سے کسی کو نہیں جانتی تھیں۔ پچھلے چند برسوں میں کپڑے کی جو قلّت رہی تھی اس کے باعث اس گاؤں کے بچے اور بھی خستہ حال دکھائی دینے لگے تھے۔ کچھ لڑکوں نے ایسی پتلونیں پہن رکھی تھیں جو لیر لیر ہونے کی وجہ سے گھاس پھوس کی بنی معلوم ہو رہی تھیں اور اس میں سے ان کی ننگی کھال دکھائی دے رہی تھی۔ جب مسز اوئیشی بچوں کی طرف دیکھ کر مسکرائیں تو ان کے چہروں پر خوف کے تاثرات اُبھرے یا وہ بالکل سپاٹ رہے۔ لیکن ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بھی ان کے انداز میں تجسس نمایاں تھا۔ ان کی نگاہوں کا یہ تجسس بالکل پرانے دنوں کا سا تھا۔ ان متجسس نگاہوں کے گھیرے میں مسز اوئیشی نے کشتی سے نیچے قدم رکھا۔ چھوٹے چھوٹے کنکر انھیں بیتے ہوئے سہانے دن یاد دلا رہے تھے۔ ان کا سر کچھ چکرا سا رہا تھا جس کی وجہ غالباً سمندر کی ہوا تھی۔ جب انھوں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا تو انھیں اپنے پیچھے بچوں کی سرگوشیاں سنائی دیں:

''شاید استانی ہیں۔''

''انھیں سلام کر کے پوچھیں؟''

استانی بے اختیار مسکرا دیں۔ تین چار چھوٹے بچے دوڑ کر ان سے آگے نکلے اور ان کے راستے میں رک کر پیچھے دیکھنے اور آداب کرنے کے لیے جھکنے لگے۔ وہ ابھی اسکول جانے کی عمر کو نہ پہنچے تھے بلکہ شاید نئی پہلی کلاس کے بچوں کی نقل کر رہے تھے جنھوں نے جھک کر آداب کرنا نیا سال شروع ہونے سے پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ ان کی تعظیم کا جواب دیتے ہوئے مسز اوئیشی کو اپنی آنکھیں بھیگتی محسوس ہوئیں۔ وہ یہ سوچ کر خوش تھیں کہ یہ بچے انھیں خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے چپکے سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرائیں۔ اب کے انھوں نے غور سے ان بچوں کے چہرے دیکھے مگر ان میں سے کوئی بھی مانوس چہرہ نہ تھا۔ راستے میں ملنے والے لوگ بھی سب کے سب اجنبی تھے۔ ''سڑک تو بالکل ویسی ہی ہے جیسی پہلے ہوا کرتی تھی مگر گاؤں والے کس قدر بدل گئے ہیں!'' مسز اوئیشی نے سوچا۔ یہ خیال ان کے ذہن سے نہ گزرا کہ تبدیلی سب سے بڑھ کر خود اُن میں آئی ہے۔ اس دوران میں بچے دو دو تین تین کر کے دوڑتے ہوئے ان سے آگے نکلتے رہے۔ بھاگتے بھاگتے مڑ کر وہ ان کی طرف دیکھنے لگتے۔ مسز اوئیشی جان بوجھ کر دوسری طرف منہ پھیر

لیتیں تا کہ اپنی آنکھوں سے بہتے چمک دار آنسو چھپا سکیں۔

تنہا گھر لوٹتے ہوئے دائے کیچی کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہنے کے بعد وہ اسکول کے پھاٹک میں داخل ہو گئیں۔ جوں ہی انھوں نے دیکھا کہ اسکول کی عمارت کی اسّی فیصد کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں، مایوسی نے کسی اونچی لہر کی طرح انھیں ڈھانپ لیا۔ مگر کچھ دیر بعد، جب وہ پرانے دنوں کی طرح اپنے کلاس روم میں کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر دیکھ رہی تھیں، ان کے دل کو قرار سا آنے لگا، کیوں کہ اسکول کی عمارت کتنی ہی خستہ حال کیوں نہ ہو چکی ہو، وہاں آنے والے شاگرد اپنے ساتھ نئی نئی چیزیں لا رہے تھے۔ کچھ بچوں کے ہاتھ میں جالی دار کپڑے کے بنے سفید بستے تھے اور کچھ گھریلو استعمال کے تھیلے بستوں کے طور پر لے آئے تھے۔ ان میں رکھی درسی کتابیں بغیر جلد کی تھیں اور ان کی حالت تہہ کیے ہوئے پرانے اخباروں کی طرح خستہ تھی۔ اس کے باوجود بچوں کے چہروں پر اشتیاق کی چمک تھی۔ ان کے چہروں کا تاثر وہی تھا جو پرانے دنوں میں بچوں کے چہروں پر ہوا کرتا تھا۔ مسز اوئیشی کو لگا کہ اٹھارہ برس پہلے پیش آنے والے واقعات گویا ابھی کل ہی پیش آئے تھے۔ چند لمحوں کے لیے تو ان کے ذہن پر ایسی دھند چھا گئی کہ تب اور اب کا درمیانی وقفہ ہی اوجھل ہو گیا۔

سال کے آغاز کی سادہ سی تقریب کے بعد وہ بچوں کو کلاس روم میں لے گئیں۔ وہ پوری تیاری کر کے آئی تھیں، پھر بھی انھیں خون اپنے چہرے کی طرف دوڑتا محسوس ہوا۔ اس گھبراہٹ کے باوجود انھوں نے بڑے تجربہ کارانہ انداز میں بچوں کے نام پکارے۔ اس سے پہلے انھوں نے شاگردوں کو نوجوان، ہموار آواز میں سمجھایا: ''جب تمھارا نام پکارا جائے تو اونچی آواز میں کہنا: حاضر۔ ٹھیک ہے؟ اچھا تو مسٹر کاکو کا واسا کی۔''

''حاضر۔''

''مسٹر یوشیو کابے۔''

''حاضر!''

''بڑے چونچال ہو تم! تمھاری آواز کتنی اونچی اور صاف ہے۔ یوشیو، کیا تم کوتسورو کے بھائی ہو؟''

جس لڑکے کو ابھی ابھی اونچی آواز میں بولنے پر داد دی گئی تھی، اس نے سر ہلا کر

اثبات میں جواب دیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ صرف حاضری میں نام پکارے جانے پر منہ سے جواب دینا ضروری ہے۔

مگر استانی صاحبہ ابھی تک مسکرا رہی تھیں۔

''مسٹر بُون کیجی اوکادا۔''

ظاہر ہے یہ ایسو کیجی کا بھتیجا تھا۔ لیکن مسز اوئیشی جانتی تھیں کہ اس کے باپ نے ایسو کیجی سے، بینائی کھو بیٹھنے کے باعث فوج سے فارغ کر دیے جانے کے بعد، اچھا سلوک نہیں کیا تھا، اس لیے انھوں نے ایسو کیجی کا نام لینے سے گریز کیا۔

''مسٹر کاتسوہیکو یاماموتو۔''

''حاضر۔''

''مسٹر گورو موری اوکا۔''

''حاضر۔''

موری اوکا! اچانک مسز اوئیشی کی یادداشت میں تاداشی کا چہرہ اُبھرا اور لمحے بھر میں غائب ہو گیا۔

''مس ماکوتو کاتاگاری۔''

''حاضر۔''

''کیا تم کوتوئے کی بہن ہو؟''

ماکوتو خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ غالباً اسے اپنی بہن یاد نہ تھی جو اس کی شیر خوارگی کے زمانے ہی میں چل بسی تھی۔ اس پر مسز اوئیشی نے پرانے زمانے کے بارے میں سوال کرنا بند کر دیا۔ کلاس میں میسا کونیشی گوچی کی بیٹی بھی تھی جس کا نام کاتسوکو تھا۔ ان کے علاوہ جو تین لڑکیاں اَور تھیں ان میں سے ایک چیسا تو کاوا موتو تھی جس نے نیا سرخ لباس پہن رکھا تھا۔ وقفے کے دوران مسز اوئیشی اس سے، سرسری لہجے میں، یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں: ''تمھارے ابّا بڑھئی ہیں نا چیسا کو؟''

چیسا کو نے اپنی آنکھیں، جو ماتسوئے سے بہت مشابہت رکھتی تھیں، جھپکتے ہوئے جواب دیا: ''نہیں۔ میرے نانا بڑھئی ہیں۔''

''اوہ! اچھا۔''

مگر انھوں نے اسکول کے رجسٹر میں اس بچی کے باپ کی جگہ بڑھئی کا نام لکھا

دیکھا تھا۔ ''پھر ماتسوئے تمھاری کون ہے؟ بہن؟'' انھوں نے پھر سوال کیا۔

''نہیں، وہ میری امّی ہیں۔ وہ اوساکا میں رہتی ہیں۔ انھوں نے میرے لیے یہ کپڑے بھیجے ہیں۔''

یہ سن کر مسز اوئیشی کو دھکا سا لگا۔ انھیں یہ سوچ کر سکون ہوا کہ ان کی نئی کلاس میں نیتا اور ماسونو نہیں ہیں۔ مگر اطمینان کے ساتھ ساتھ انھیں ان دونوں کی کمی بھی محسوس ہوئی۔ اگر نیتا کلاس میں ہوتا تو دس کے دس شاگردوں کے گھریلو معاملات اب تک آشکار ہو چکے ہوتے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کی عرفیت سے استانی کو آگاہ کر چکا ہوتا۔ مسز اوئیشی کو نیتا، تاکے ایچی، تاداشی، ایسوکیچی، ماتسوئے، فوجیکو اور باقی سب بچے یاد آئے۔ ان کی نئی کلاس کے دس بچے، جو آج پہلی بار اسکول آئے تھے، اور پچھلے شاگردوں کی طرح اپنی استانی پر پوری طرح بھروسا کر رہے تھے، ان کے ذہن سے غائب ہو گئے اور ان کی جگہ اُن بارہ بچوں نے لے لی جو ایک بار صنوبر کے پیڑ کے نیچے جمع ہوئے تھے۔ انھوں نے بے اختیار کھڑکی سے باہر دیکھا اور صنوبر کے پیڑ کو پہلے کی طرح اپنی جگہ موجود پایا۔ وہ ان کے دونوں بیٹوں کے وجود سے بے خبر معلوم ہوتا تھا جو اس وقت اسکے پاس کھڑے راس کے گاؤں کی جانب دیکھ رہے ہوں گے۔

مسز اوئیشی چپکے سے کھیل کے میدان کے ایک کونے میں گئیں اور آنسو پونچھ کر اپنے چہرے کی حالت درست کرنے لگیں۔ اگرچہ انھیں خبر نہ تھی، لیکن شاگردوں نے اپنی جذباتی استانی کے لیے ایک عرفیت ابھی سے طے کر لی تھی۔ آخر گاؤں میں ایک نہ ایک نیتا تو اب بھی موجود تھا۔ بچوں کی تیز نظروں سے ان کی استانی کی خفیف سے خفیف حرکت بھی چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ ان کی عرفیت تھی: ''مسز روہانسو۔''

MashalBooks.com

ایک روشن دن

گو اپریل کا مہینہ آ پہنچا تھا مگر اس سہ پہر ساحل کی ہوا میں خنکی تیر رہی تھی۔ مسز اوئیشی، جو ریت پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھیں، اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے لباس کے گھٹنوں پر سے ریت جھاڑنے لگیں۔ تبھی انھیں اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی۔ ''مسز اوئیشی، آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' یہ میسا کونیشی گوچی کی آواز تھی۔

''اوہ، میسا کو!''

خوش رنگ پھولوں سے سجے ریشمی کیمونو اور اس پر جالی دار کپڑے کی پُر تکلف اوڑھنی میں ملبوس میسا کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کہیں باہر جا رہی ہے۔ رسمی سلام دعا کے بعد وہ اچانک بڑی اُنسیت بھری آواز میں باتیں کرنے لگی: ''میں اسکول ہی جا رہی تھی۔ آپ سے ملنے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر جھکی اور کہنے لگی: ''خوش قسمتی سے میری بیٹی کاتسو کو بھی آپ کی کلاس میں ہے۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔''

اس کا ہموار لہجہ اور پُر وقار طور اس کی ماں کی یاد دلاتے تھے۔ مگر جلد ہی اس کا پرانا انداز لوٹ آیا اور وہ اپنی استانی سے مانوس انداز میں بات کرنے لگی۔ ''جب میں نے سنا کہ آپ گاؤں میں پڑھانے واپس آ رہی ہیں تو مارے خوشی کے رونے لگی۔ آپ میری استانی تھیں اور اب میری بیٹی کی بھی استانی ہیں۔ ایسا اتفاق کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ اور مجھے آپ کو صحت مند دیکھ کر بھی بڑی خوشی ہو رہی ہے۔''

''ہاں، ویسے تو ہم سب کو بڑا سخت زمانہ دیکھنا پڑا۔ ہے نا؟''

میسا کو جواب دیے بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ''یہی جگہ تھی نا جہاں آپ کے پیر میں چوٹ لگی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں گزرے دنوں کی یادوں کی جھلک تھی۔

''ہاں، یہی جگہ تھی۔ تمھیں کیسا یاد رہا!''

''میں تو بھول ہی نہیں سکتی۔ مجھے اکثر اس کا خیال آتا ہے اور میں سانائے سے

اس کے بارے میں بات بھی کرتی ہوں۔ ہمارا تو یہ خیال ہو گیا ہے کہ ہماری کلاس اس گاؤں کے سب سے انوکھے بچوں کی کلاس تھی۔ آپ کو یاد ہے ایک بار ہم سب پیدل آپ کے گھر جا پہنچے تھے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے دور اُفتادہ صنوبر کے پیڑ کی جانب نظر ڈالی۔ عین اس وقت اسے دائے کیچی کی کشتی اس طرف بڑھتی دکھائی دی اور وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ کشتی کافی نزدیک آ پہنچی تھی۔ کشتی کی طرف رُخ کر کے مسز اوئیشی نے گردن ہلائی اور مسکراتے ہوئے وضاحت کی: ''میسا کو، یہ میرا بیٹا ہے۔ ہر روز مجھے واپس لے جانے آتا ہے۔'

''یہ سن کر میسا کو حیرت سے چلّا اٹھی: ''اچھا، واقعی؟''

کیا میسا کو کو پتا نہیں ہے کہ دائے کیچی پچھلے تین دن سے مجھے لینے آ رہا ہے؟ مسز اوئیشی سوچنے لگیں۔ میسا کو کو بے خبری کا یہ انداز اپنے خاندان سے ورثے میں ملا تھا، ان لوگوں کو ہمیشہ سے الگ تھلگ رہنے کی عادت تھی۔ لیکن وقت کے طوفان نے اس کے مکان کی اونچی گارے کی دیوار پر چڑھ کر اس کے شوہر کو اس سے چھین کر گھر واپس نہ آنے والے سپاہیوں میں شامل کر دینے میں کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت اپنی استانی کے سامنے کھڑی میسا کو کسی نوعمر لڑکی کی طرح بے پروا دکھائی دے رہی تھی اور پہلے کی طرح خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے پاس پہننے کے لیے سادہ لبادوں کے سوا کچھ نہ تھا جب کہ میسا کو عمدہ لباس پہنے تھی جو کسی مال دار گھرانے کی نوجوان بہو کے شایانِ شان تھا۔ مشکلات سے بھرے زمانے سے وہ کس طرح گزر رہی تھی؟ جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ نیشی گوچی خاندان کا گودام چھت تک فوجی سامان سے بھرا ہوا ہے، لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ملی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ میسا کو کا خاندان اسی سامان کی بدولت مال دار ہو گیا تھا، لیکن اُس کے چہرے سے ایسے کسی احساسِ جرم کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

میسا کو اپنی استانی کے پہلو میں کھڑی، کشتی کے ہر بار ڈولنے پر سچ مچ پریشانی کا اظہار کرتی رہی۔ ''مسز اوئیشی، بہت تیز ہوا چل رہی ہے، اتنا سا لڑکا کشتی کو کیسے سنبھال پائے گا۔ ارے ارے، دیکھیے! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔''

کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے دائے کیچی کا ننھا سا بدن کشتی سمیت سمندر کی لہروں میں غائب ہو جائے گا۔ مگر چھوٹی سی کشتی اور چھوٹا سا لڑکا اتنی مشقت سے آگے بڑھ رہے تھے

کہ کنارے پر کھڑی ان کی طرف دیکھتی دونوں عورتیں بھی اس کا دباؤ محسوس کر رہی تھیں۔ ساحل پر خنکی تھی مگر دائے کیچی کا بدن پسینے میں شرابور معلوم ہو رہا تھا۔

''کیا آپ اب سائیکل نہیں چلاتیں؟'' میساکو نے پوچھا۔ لیکن مسز اوئیشی اتنی تشویش کی حالت میں تھیں کہ اس کے سوال کی طرف توجہ نہ دے سکتی تھیں۔ ان کی نظریں لہروں سے لڑتے دائے کیچی پر جمی ہوئی تھیں اور انھیں شدید خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ کسی طرح اسے اور اس کی کشتی کو بہ حفاظت کنارے پر لے آئیں۔

میساکو نے اپنی بات جاری رکھی: ''بارش یا تیز ہوا میں کشتی کھینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سائیکل پر آنے میں آپ کا وقت بھی بچے گا، ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، مگر سائیکلیں آج کل بازار میں ملتی کہاں ہیں۔ مل بھی رہی ہوتیں تو پتا نہیں میں خرید بھی سکتی یا نہیں،'' استانی نے کشتی پر سے ایک لمحے کو نظر ہٹائے بغیر جواب دیا۔ تب ہی انھیں یاد آیا کہ اُن پرانے اچھے دنوں میں بھی سائیکل انھیں قسطوں پر خریدنی پڑی تھی۔ تومیکو، سائیکلوں کے تاجر کی بیٹی، جس نے اس معاملے میں ان کی مدد کی تھی، شادی کر کے تاکیو جا بسی تھی۔ جنگ شروع ہونے کے بعد سے، جب پوسٹ کارڈ تک مشکل سے ملنے لگے تھے، مسز اوئیشی کو اس کا کوئی خط نہیں ملا تھا۔ جنگ کے آخری دنوں میں انھیں اپنی اس سہیلی کا دوبارہ خیال آیا تھا جس کا شوہر بھی تو کیو میں ہونجو کے مقام پر سائیکلوں کی دکان چلاتا تھا۔ انھوں نے سوچا تھا کہ یہ دونوں کہاں ہوں گے اور ان کی آپس میں کیسی گزر رہی ہوگی؛ انھیں اندیشہ تھا کہ تومیکو کے سب گھر والے کہیں نو مارچ کے ہوائی حملے میں ہلاک نہ ہو گئے ہوں۔ اس وقت تک ان کا ذہن اپنی قسمت میں ہونے والی تبدیلیوں میں اس قدر الجھا رہا تھا کہ انھیں دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔

شہر ''ک'' کے اس مکان میں جہاں تومیکو کے ابّا رہتے تھے سائیکلوں کی دکان اب بھی تھی۔ مگر جنگ کے دوران کسی وجہ سے دکان کا مالک بدل گیا تھا اور اب وہاں صرف ایک بوڑھا آدمی تھا جو ہمیشہ خستہ حال دکھائی دیتا تھا اور بیٹھا پرانی، گندی سائیکلوں کی مرمّت کیا کرتا تھا۔ یہ بوڑھا بھی اپنے وارث سے محروم ہو چکا تھا۔

آخر مجھے نئی سائیکل کہاں سے مل سکتی ہے؟ مسز اوئیشی سوچنے لگیں۔ مگر میساکو سیدھے سادے لہجے میں کہہ رہی تھی: ''اگر آپ سائیکل خریدنا چاہتی ہوں تو مجھے بتایئے

گا۔''

یہ پوچھنے کا موقع نہ تھا کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے، کیوں کہ دائے کیچی کی کشتی کی رفتار اچانک تیز ہوگئی تھی اور وہ ساحل کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ شاید اب وہ راس کی اوٹ میں آ گئی تھی جہاں ہوا کا زور اتنا شدید نہ تھا۔ لڑکا اپنی ماں کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر میسا کو کی طرف سے بے اعتنائی کے ساتھ گردن پھیر لی۔ اس نے معمول کے مطابق بانس کی مدد سے کشتی کو کنارے پر لگایا اور اپنی ماں کے سوار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک اسی لمحے اس اجنبی عورت نے اسے مخاطب کیا: ''نیچے اتر آؤ، ننھے لڑکے۔ میں کشتی کو تھامے رکھوں گی۔''

جب اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا تو اس کی امّی مسکرا کر بولیں: ''ہاں، تھوڑی دیر آرام کرلو، دائے کیچی۔''

لڑکے نے کچھ بولے بغیر انکار میں سر ہلا دیا۔ مسز اوئیشی نے اپنی بات جاری رکھی: ''مجھے ان خاتون سے کچھ بات کرنی ہے۔ کیا تم تھوڑا سا انتظار کرلو گے؟''

دائے کیچی جواب دیے بغیر خفگی کے ساتھ کشتی سے کود کر اتر آیا۔ جب وہ کشتی کو رسی سے ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ باندھ چکا تو اس کی امّی نے اسے آواز دی۔ ''یہاں آؤ، دائے کیچی۔''

وہ سائیکل کے بارے میں میسا کو سے بات چیت اس کی موجودگی میں کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان دونوں کے بیچ میں بیٹھ کر، جب کہ میسا کو اپنی بات بھول چکی تھی اور دائے کیچی کسی بالغ آدمی کی طرح اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے سمندر کے پار دیکھ رہا تھا، سائیکل کی بات کرنے کو ان کا جی نہ چاہا۔ میسا کو کے ذہن میں جو بھی ترکیب ہو، ذمے داری تو بعد میں ہمیں کو اٹھانی ہوگی، مسز اوئیشی نے سوچا۔ خاموشی کے ایک تکلیف دہ حد تک طویل وقفے کے بعد میسا کو ہلکے پھلکے انداز میں یوں بولنے لگی جیسے ان کا دل بہلانا چاہتی ہو۔ ''ابھی چند دن پہلے میں سانائے سے بات کر رہی تھی تو ہمیں خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی کلاس کے تمام ساتھوں کو بلا کر آپ کے استقبال کے لیے ایک دعوت کی جائے۔''

''اوہ، یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مگر بھلا میں ایسے استقبال کے لائق کہاں ہوں۔ یہاں واپس آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ میں پہلے کی طرح جوان اور توانا ہوں۔ مگر یہاں پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں بہت جذباتی ہوگئی ہوں۔ ہر یاد مجھے افسردہ

کر دیتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھیں جلدی سے صرف کرتے ہوئے وہ پُرعزم آواز میں کہتی رہیں: ''مگر بہرحال، تمھاری تجویز کا بہت بہت شکریہ۔ ویسے تمھاری کلاس کے ساتھیوں میں سے کتنے یہاں رہ رہے ہیں؟''

''دو مرد اور تین عورتیں۔ مگر ہم کوتسورو اور ماتچان کو بھی بلانا چاہتے تھے۔''

''تمھارا مطلب ہے ماتسوئے کا واموتو کو؟''

''ہاں۔ بہت دنوں تک تو ہمیں خبر ہی نہ تھی کہ وہ ہے کہاں، مگر جنگ کے دنوں میں ایک بار وہ نہ جانے کہاں سے گاؤں آئی تھی۔ وہ بہت کم وقت ٹھہری اور پھر واپس چلی گئی۔ مگر میرا خیال ہے ماسونو کے پاس اس کا پتا ہے۔ ماتچان اتنی خوب صورت ہوگئی ہے کہ میں تو اسے پہچان ہی نہیں سکی۔'' ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے پر عجیب سا تاثر اُبھرا۔ مسز اوئیشی نے یہی ظاہر کیا کہ انھیں اس کا احساس نہیں ہوا ہے، لیکن انھیں وہ بات یاد آ گئی جو دو روز پہلے ان کی کلاس میں پیش آئی تھی۔

''تمھارے ابّا بڑھئی ہیں نا چیسا کو؟'' انھوں نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔ میرے نانا بڑھئی ہیں۔''

''ماتسوئے تمھاری کون ہے؟ بہن؟''

''نہیں، وہ میری امّی ہیں۔ اوساکا میں رہتی ہیں۔ انھوں نے میرے لیے یہ کپڑے بھیجے ہیں،'' بچی نے جواب دیا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں بالکل ماتسوئے سے مشابہ تھیں۔

اس وقت مسز اوئیشی میسا کو سے اس بچی کے بارے میں نہیں پوچھنا چاہتی تھیں۔ وہ اس سے ایک اَور سوال کرنا چاہ رہی تھیں۔

''میں فوجیکو کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ وہ کیسی ہے؟ کسی کو اس کی کچھ خبر ہے؟''

میسا کو نے اُسی تاثر کے ساتھ جواب دیا جو ماتسوئے کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر اُبھرا تھا۔ ''اس کی ہمیں بالکل کچھ خبر نہیں۔ جنگ کے دنوں میں سنا تھا کہ خوش قسمتی اسے کسی نو دولتیے نے خرید لیا ہے، لیکن شاید وہ جنگ ہی کے نتیجے میں مال دار ہوا ہوگا، اس لیے مجھے شک ہی ہے کہ وہ اب تک اچھے حال میں ہوگی۔'' وہ ناداستگی میں اپنے احساسِ برتری کا اظہار کرنے لگی تھی۔ اس بات سے اور ماتسوئے اور

فوجیکو کی بدنصیبی سے گویا آنکھیں چُراتے ہوئے، جو طوفانی راستوں پر پڑ گئی تھیں، مسز اوئیشی نے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں، جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر، بولیں: ''جو زندہ ہیں اُن سے تو ملاقات ہو ہی جائے گی، مگر جو مر چکے ہیں اُن سے کہاں ملنا ہوگا۔''

اس بات نے میسا کو پر اثر کیا اور اس کی بھی آواز دھیمی ہو گئی: ''سچ ہے۔ جیسے اُس گیت میں ہے: مُردہ پیڑوں پر پھل آتے ہیں نہ پھول..... آپ کو کوتوئے کی موت کی خبر ملی؟''

مسز اوئیشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر میسا کو نے پوچھا: ''اور سونکی کی؟''

انھوں نے پھر پہلے کی طرح سر ہلا دیا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ انھیں یاد آیا کہ وہ اس اطلاع پر کہ ایسو کیچی کو بینائی کھو بیٹھنے کے باعث فوج سے فارغ کر دیا گیا ہے، سانائے کے ساتھ مل کر کتنا روئی تھیں۔ اُس دن کا دکھ ان کے دل میں آج بھی جما بیٹھا تھا۔ سانائے نے بتایا تھا کہ جب وہ ایسو کیچی سے ملنے گئی تو وہ اپنا سر گھٹنوں تک جھکائے بیٹھا تھا اور حوصلہ شکن آواز میں بڑبڑا رہا تھا کہ اس سے تو مر جانا بہتر تھا۔ مسز اوئیشی تب اس لیے روئی تھیں کہ انھیں اس لڑکے سے ہم دردی محسوس ہو رہی تھی جو پرانی اشیا کی دکان کا ہیڈ کلرک بننا چاہتا تھا مگر جسے محتاج کے طور پر اپنے افلاس زدہ گھر لوٹنا پڑا تھا۔ مگر اب ان کا یہ احساس جاتا رہا تھا، کیوں کہ انھیں خبر ملی تھی کہ ایسو کیچی نے اس عمر میں تربیت حاصل کر کے قصبے میں مساج کرنے والے کا کام شروع کر دیا ہے۔ وہ سوچنے لگیں کہ وہ اپنی گزر بسر کے واحد وسیلے کے سہارے اندھیرے میں کیوں کر زندہ رہے گا۔ مگر میسا کو نے ایک ایسی بات کہی جس سے اس کی کٹھور طبیعت کا اظہار ہوتا تھا: ''وہ زندہ تو لوٹ آیا، مگر کرے گا کیا؟ اندھا ہو گیا ہے۔ اس سے تو مر جاتا تو شاید اچھا ہوتا: ''اس کی بات سن کر لگتا تھا کہ اسے ذرا اندازہ نہیں ہے کہ ایسو کیچی کے اندھا ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اب مسز اوئیشی سے نہ رہا گیا۔ بولیں: ''کیسی باتیں کر رہی ہو، میسا کو؟ اب تو وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور پھر وہ تمھارا کلاس کا ساتھی ہے۔''

میسا کو کو یہ بات اتنی ہی ناگوار لگی جتنی اسکول کی بچی کو استانی کی ڈانٹ بُری لگتی ہے۔ ''مگر..... مگر ایسو کیچی تو ہر ملنے والے سے خود یہی کہتا ہے کہ اس سے تو مر جانا بہتر ہوتا۔ میں نے تو یہی سنا ہے،'' اس نے سُرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا جیسے اسے اپنی سنگ دلی کا پہلی بار احساس ہو رہا ہو۔

MashalBooks.com

''کیا تمھیں یہ بات سن کر اس سے ہم دردی نہیں ہوتی ؟ اسکی بات کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کے پاس زندہ رہنے کے راستے بہت کم رہ گئے ہیں۔ بے چارہ ایسو کیچی ! کیا تمھیں اس پر افسوس نہیں ہوتا ؟''

''ہوتا کیوں نہیں۔ بہت افسوس ہوتا ہے۔ آخر ہم ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے..... وہ اور میں۔ مگر بہر حال، کلاس کے کئی ساتھی بڑے بدقسمت نکلے۔ پانچ میں سے تین لڑکے جنگ کی وجہ سے مارے گئے۔ ایسی بھی کوئی کلاس نہیں ہوگی۔''

عین اس وقت دائے کیچی نے برابر میں بیٹھی اپنی ماں کے پہلو میں ٹہوکا دیا۔ انھوں نے ایک دم چونک کر نظر اٹھائی۔ ان کے بالکل پیچھے چند بچے ایک ٹیڑھا میڑھا نصف دائرہ بنائے کھڑے تھے اور تجسس بھری نظروں سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ استانی کے نظر اٹھا کر دیکھنے پر بچے بھرّا مار کر اڑتی چڑیوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے، اور بھاگتے بھاگتے چلّانے لگے: ''مسز روہانسو! مسز راہانسو!''

انھیں بھاگتے ہوئے ساحل کے بالکل پیچھے کی پہاڑی پر بنے قبرستان کی طرف جاتے دیکھ کر مسز اوئیشی نے کہا: ''میسا کو، چلو قبرستان چلتے ہیں، کیا خیال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ مگر پہلے ذرا پانی لے لیں۔'' میسا کو جلدی سے اٹھی اور سڑک کے پاس والے مکان کی طرف لپکی۔ کچھ دیر بعد جب مسز اوئیشی نے اسے بالٹی اٹھائے آتے دیکھا تو سر کی حرکت سے قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے بولیں: ''بس، دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تم انتظار کر لو گے؟'' میں اپنے سابق شاگردوں کی قبروں پر جا رہی ہوں۔ اگر چاہو تو تم بھی چلے چلو۔''

دائے کیچی کو، جو بظاہر غیر مطمئن نظر آ رہا تھا، وہیں چھوڑ کر دونوں عورتیں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔

''ارے، تم کتنی لمبی ہوگئی ہو، میسا کو! کلاس میں تو تمھارا قد سب سے چھوٹا ہوتا تھا۔''

''نہیں، سب سے چھوٹی کوتوئے تھی، اس کے بعد میرا نمبر تھا۔ یہ ہے کوتوئے کی قبر، مسز اوئیشی۔۔۔''

قبر راستے سے تھوڑا سا ہٹ کر تھی۔ ایک چھوٹی سی، بدرنگ اور موسموں کی مار کھائی ہوئی لکڑی کی چھت کے نیچے، مردہ خانے کا چھوٹا، اُتنا ہی سیاہ اور گندا شناختی نشان

پہلو کے بل پڑا ہوا تھا۔ ایک پیالی میں، جو شاید کوتوئے اپنی زندگی میں برتتی رہی ہوگی، گدلا پانی پاس رکھا ہوا تھا اور نصف کے قریب خشک ہو چکا تھا۔ میساکو اسے اوپر تک بھرنے لگی اور مسز اوئیشی نے شناختی نشان اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کوتوئے کے سابق وجود کا بس یہی حصّہ باقی بچا تھا۔ اس پر بس اتنا لکھا تھا: ''ذاتی نام: کوتوئے۔ موت کے وقت عمر: ۲۰ سال۔'' آہ بے چاری، استانی نے سوچا، کتنی غمناک اور مختصر زندگی پائی اس نے۔ وہ علاج معالجے اور اپنے خاندان والوں کی طرف سے دیکھ بھال کی سہولت حاصل کرنے تک سے بالکل مایوس ہو چکی تھی اور اپنے گھر کی سامان کی کوٹھری میں سب کی توجہ سے دور تنہائی میں چل بسی۔

''میرے ابّا ہمیشہ گلہ کرتے رہتے ہیں کہ میں لڑکا کیوں نہ پیدا ہوئی۔ میرے لڑکی ہونے کی وجہ سے میری امّی کو بھی بہت مشکل اٹھانی پڑتی ہے.....'' مسز اوئیشی اب بھی اپنے ذہن میں کوتوئے کا چہرہ دیکھ سکتی تھیں جس نے چھٹی کلاس میں یہ باتیں اس طرح کی تھیں جیسے اس کے لڑکی ہونے کی ذمے داری خود اس پر یا اس کی ماں پر ہو۔ لیکن اگر، جیسا کہ اس کی خواہش تھی، وہ لڑکا بھی پیدا ہوئی ہوتی تو ممکن تھا کہ جوانی میں مرگئی ہوتی اور اب تک اسے سپاہیوں کے قبرستان میں دفن کیا جا چکا ہوتا، انھیں خیال آیا۔ ان کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔

''جاؤ بھاگو، کیا دیکھ رہے ہو!'' میساکو نے زور سے کہا جس پر مسز اوئیشی کو اندازہ ہوا کہ کوئی انھیں دیکھ رہا ہے۔

''اب تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ میں واقعی مسز روہانسو ہوں،'' وہ مسکرائیں۔ میساکو نے بھی مسکراتے ہوئے بالٹی ان کے ہاتھ میں تھما دی گویا پانی ڈالنے کو کہہ رہی ہو۔ ''اس میں کچھ پانی ہے، مسز اوئیشی۔'' شاید وہ یہاں نرسل کی کونپلیں لگاتی رہی ہوگی کیوں کہ پیالی میں کچھ ہرے پتّے دکھائی دے رہے تھے۔

سپاہیوں کا قبرستان پہاڑی کی چوٹی پر تھا۔ وہاں قبروں کے پتھر زمانی اعتبار سے ترتیب دیے گئے تھے: چین جاپان جنگ، روس جاپان جنگ، چین کی لڑائی، وغیرہ۔ ان سب کے بعد نئی قبریں آتی تھیں جن پر صرف لکڑی کے کتبے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ گل کر نیچے گر پڑے تھے۔ مگر نیتا، تاکے ایچی اور تاداشی کی قبروں کے کتبے تازہ تھے اور مضبوطی سے جمے کھڑے تھے۔ اس زمانے کی افراتفری کا رنگ یہاں بھی نمایاں تھا، اور یہ

بات بھی صاف ظاہر تھی کہ لوگ ان نوعمر لڑکوں کی قبروں کے آگے پھول ڈالنے سے بھی بے پروائی برتتے تھے جو، مسز اوئیشی کے احساس کے مطابق، معصومیت میں اس جھگڑے میں پڑ کر اپنی جان گنوا بیٹھے تھے۔ سہ پہر کی دھوپ کچھ قبروں کے سامنے رکھے گلدانوں میں لگی کمیلیا کی مُردہ اور سوکھی شاخوں پر پڑی رہی تھی۔ اگرچہ سپاہیوں کا قبرستان نیا تھا اور اس کی حد بندی بالکل واضح تھی، مگر ان دنوں اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے قبروں پر سائباں بنانا لوگوں کی استطاعت سے باہر تھا۔ مسز اوئیشی کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اپنے شوہر کی قبر کو یاد کر کے، جو اتنی ہی سادہ تھی، انھوں نے اِدھر اُدھر اُگے ہوئے خودرو پھول چُنے اور انھیں قبروں کے پاس رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اور میسا کو خاموشی کے ساتھ قبرستان سے باہر نکل آئیں۔ وہ اب رو نہیں رہی تھیں مگر ان کا پیچھا کرتے ہوئے بچے اب بھی ''مسز روہانسو'' کی آوازیں لگا رہے تھے۔ مسز اوئیشی مڑیں اور جواب میں کہنے لگیں: ''ہاں!''

اس پر صرف میسا کو ہی کو حیرت نہیں ہوئی۔ جب پیچھے کھڑے ہوئے بچے زور زور سے ہنسنے لگے تو انھوں نے میسا کو سے، جو اب تک اس قصّے سے بے خبر تھی، کہا: ''عجیب وغریب عرفیت مجھے دی گئی ہے۔ مسز روہانسو کا نام ملا ہے!''

مئی کے اوائل کی ایک صبح، جب ہوا میں نئے پتّوں کی کچی مہک تھی، اسکول کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے مسز اوئیشی کی ملاقات پہلی کلاس کی بچی کاتسوکو نیشی گوچی سے ہوئی جو لگتا تھا کہ انھیں کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''مسز اوئیشی، آپ کے لیے ایک خط آیا ہے۔'' کاتسوکو نے بڑے فخریہ انداز میں خط انھیں پیش کیا۔ اس میں لکھا تھا:

> ''اتوار آپ کی چھٹی کا واحد دن ہے اور اس روز آپ کو گھر پر خاصا مصروف رہنا پڑتا ہوگا۔ مگر اس کے باوجود ہم پورے خلوص سے امید رکھتے ہیں کہ آئندہ اتوار کو آپ ہماری پارٹی میں ضرور آئیں گی۔ ہم آپ سے مشورہ کر کے ضرور معلوم کرتے کہ آپ کے لیے کون سا دن مناسب رہے گا، لیکن گیہوں کی فصل پک گئی ہے اور اب کٹائی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر یہ موقع نکل گیا تو شاید ہم سب ایک جگہ اکٹھے نہ ہو سکیں گے، اس لیے ہم نے

جلدی جلدی سارا انتظام کر لیا ہے۔ امید ہے کہ ہماری کلاس کے
اکثر ساتھی پارٹی میں آ جائیں گے، اور آپ سے بھی درخواست ہے
کہ ضرور تشریف لائیں۔''

یہ اُس پارٹی کا دعوت نامہ تھا جس کا ذکر میسا کو نے پچھلی ملاقات میں کیا تھا۔ خط پر جو دستخط تھے ان میں مسز اوئیشی نے میسا کو اور ماسونو کے دستخط پہچان لیے لیکن یہ بات پہلے جملے ہی سے ظاہر تھی کہ خط کا مضمون سانائے نے تیار کیا ہے۔ اسے پورا پڑھنے کے بعد مسز اوئیشی نے کاتسوکو سے کہا: ''اپنی امّی سے کہنا کہ میں نے ہاں کہا ہے۔ سمجھ گئیں؟ کیا کہو گی۔ کہنا: ہاں۔''

لیکن بعد میں اپنی ڈیسک پر بیٹھ کر انھوں نے خود سے کہا: ''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' بات دراصل یہ تھی کہ ابھی گزشتہ رات انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں سے وعدہ کیا تھا کہ دو دن بعد یاتسو کی پہلی برسی منائیں گی، اور وہ دن اتوار ہی کو پڑ رہا تھا، حالاں کہ یاتسو کی پہلی برسی کا اصل دن ابھی کئی ماہ دور تھا۔ جب انھوں نے اعلان کیا کہ اس موقعے پر وہ دہی پھلیوں اور اُبلے ہوئے چاولوں کا خاص پکوان تیار کریں گی، تو نامیکی اپنے پورے بدن کا زور لگا کر خوشی سے چلّانے لگا تھا اور دائے کیچی نے بڑے بھائیوں کی سی سنجیدگی سے کہا تھا:

''امّی، اس میں سے کچھ حصّہ ہم یاتسو کی قبر پر لے جائیں گے۔ میں کل اسکول سے واپسی پر چور بازار سے دہی پھلیاں خرید لاؤں گا۔ کتنی خریدوں، امّی؟ ان کے لیے خشک پھلیوں کی کتنی پیالیوں کی ضرورت ہوگی؟ اور امّی، کیا ہمیں بوتل میں چاول صاف کرنا ابھی سے شروع کر دینا چاہیے؟''

یہ دائے کیچی کی عادت تھی کہ جب جوش میں ہوتا تو امّی امّی کی تکرار ضرور کرتا۔ اسے بھی اس تجویز پر بہت خوشی ہو رہی ہوگی۔ جب وہ جا کر کہیں گی کہ وہ اس تقریب کو ملتوی کر رہی ہیں تو ان دونوں کو کتنی مایوسی ہوگی، مسز اوئیشی نے سوچا۔ حالات ایسے تھے کہ انھیں کسی مہمان کو دعوت دینے یا مَہنت کو بلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ ان کے یہ پروگرام بنانے کا ایک مقصد اپنے دونوں بیٹوں سے ممنونیت کا اظہار کرنا تھا جو ان کے اسکول میں ہوتے ہوئے گھر کا کام سنبھالتے تھے اور انھیں اسکول چھوڑنے اور گھر واپس لے جانے

MashalBooks.com

آتے تھے، اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اپنی تنخواہ کی خوشی منا سکیں جو انھیں بہت طویل عرصے بعد ملی تھی۔ انھوں نے اس موقعے کو یاتسو کی یاد سے منسوب کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ پہلی کلاس کی بچیوں کو دیکھ دیکھ کر انھیں یاتسو کا خیال آتا رہتا تھا، اور اپنے سابق شاگردوں کی قبریں دیکھ کر انھیں اپنی بیٹی کی یاد اور زیادہ ستانے لگی تھی۔

اس روز گھر پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنے بیٹوں سے وضاحت کرنی شروع کی:

''سنو، میرے بچو، ایک مشکل ہوگئی ہے۔ بات یہ ہے کہ آنے والے اتوار کو مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ یاتسو کی برسی کو ایک ہفتے کے لیے ملتوی کر دیتے ہیں، کیا خیال ہے؟''

''ہرگز نہیں!''

''بالکل نہیں!'' لڑکوں نے بلند آواز میں احتجاج کیا۔

''اچھا اچھا۔ مگر میں واقعی بڑی مشکل میں پڑ گئی ہوں۔ میرے سابق شاگردوں نے میرے استقبال کے لیے پارٹی کی ہے۔ پتا ہے، وہ میرا خیر مقدم کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کی دعوت پر کیسے انکار کر سکتی ہوں؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا، امّی!'' نامیکی، جسے اکثر گھر پر تنہا رہنا پڑتا تھا، زور سے بولا۔ دائے کیچی خاموش رہا جیسا کہ بڑے بھائی سے توقع کی جانی چاہیے، لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے کس قدر مایوسی ہوئی ہے۔

''میں جانتی ہوں۔ یہی تو مشکل ہے۔ تم دونوں کو میرے ساتھ مل کر اس معاملے پر غور کرنا چاہیے۔ کیا واقعی تم یہ چاہتے ہو کہ میں پارٹی میں جانے کے بجائے گھر پر رہوں؟'' پھر انھوں نے دونوں کو دعوت نامہ پڑھ کر سنایا۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد نامیکی نے غیر مطمئن لہجے میں کہا: ''آپ نے پہلے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اس لیے آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ یہ جمہوریت ہے۔''

''جمہوریت'' کا لفظ سن کر مسز اوئیشی زور سے ہنس پڑیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ''اچھا چلو، ایک کام کرتے ہیں۔ یاتسو کی برسی تو ہمیں ملتوی کرنی ہی ہوگی، لیکن اس کی تلافی کے لیے اس اتوار کو بڑے گاؤں میں پکنک پر چلتے ہیں۔ میری پارٹی سوئی گیتسورو میں ہوگی، جانتے ہو نا، یہ وہی ریستوراں ہے جسے میری سابق شاگرد ماسونو کا گاوا چلاتی ہے۔ جب تک پارٹی ختم ہو، تم دونوں وہاں مندر کے

پاس کھیلتے رہنا۔ پھر بندرگاہ پر جا کر کھانا کھا لینا۔ ارے ہاں، ایک اَور خیال آیا۔ اگر تم بنسیاں ساتھ لے جاؤ تو وہاں مچھلیوں کا شکار بھی کر سکتے ہو۔ بہت مزہ آئے گا! کیا خیال ہے؟''

''ارے واہ! یہ تو بہت اچھا پروگرام ہے!'' ایک بار پھر نامیکی ہی خوشی کے مارے چلاّ اٹھا۔ دائے کیچی نے صرف سر کے اشارے اور مسکراہٹ سے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

اتوار کی صبح کو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکے بادل، جو بارش لانے والے نہ ہوں، صنوبر والے گاؤں سے نکل کر ڈھائی میل کا راستا پیدل طے کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ پارٹی کا وقت دوپہر ایک بجے طے پایا تھا اس لیے تینوں جلد ہی، یعنی بارہ بجے، گھر سے روانہ ہو گئے۔ وہ اسی سڑک پر پیدل چلنے لگے جس پر بس کے ذریعے بڑے گاؤں تک پہنچنے میں صرف پندرہ منٹ لگتے تھے۔

تینوں ایک ساتھ شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتے تھے، اس لیے راستے میں ملنے والے ہر شخص نے دریافت کیا: آپ لوگ اکٹھے کہاں جا رہے ہیں؟''

ہر بار نامیکی نے جواب دیا۔ ''ہم پیک نیک پر جا رہے ہیں،'' وہ مذاق کے لہجے میں کہتا۔ وہ پِک نک کو جان بوجھ کر ''پیک نِیک'' کہہ رہا تھا، لیکن اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن کسی نے دوبارہ سوال بھی نہیں کیا۔ دونوں لڑکوں کے لیے یہ بڑی مزے کی بات تھی۔ ہر بار جب انھیں اپنا کوئی واقف شخص سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو وہ سرگوشی میں، کہ ان تینوں کے سوا کوئی نہ سن سکے، کہتے: ''آپ لوگ اکھٹے کہاں جا رہے ہیں؟'' اور ہر بار ان کا اندازہ بالکل درست نکلتا۔

''آپ لوگ اکٹھے کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ شخص دریافت کرتا۔

''ہم پِیک نِیک پر جا رہے ہیں،'' نامیکی تیزی سے جواب دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ دائے کیچی اس کے پیچھے بھاگتا۔ پھر وہ دونوں زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ہنسنے لگتے۔ انھوں نے اس قسم کا تجربہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا اس لیے انھیں بہت لطف آ رہا تھا۔ بار بار ایک ہی بات دُہراتے دُہراتے آخر انھیں اپنی جان پہچان کے لوگ ملنے بند ہو گئے۔ اب وہ قریب کے قصبے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جب وہ اس مقام کے نزدیک پہنچے جہاں انھیں اپنی امّی سے رخصت ہونا تھا، تو دونوں بھائی جو اَب تک اتنے خوش و خرم دکھائی دے رہے

تھے، کچھ فکر مند ہو کر باری باری پوچھنے لگے:

''امّی، اگر ہماری پکنک آپ کی پارٹی سے پہلے ختم ہوگئی تو ہم کیا کریں گے؟''

''پھر تم سوئی گیتسورو کے پاس والے ساحل پر آ کر کھیلنے لگنا، کنکریاں اچھالنا یا کچھ اَور کرنا۔

''اور اگر گاؤں کے لڑکے آ گئے اور ہمیں تنگ کرنے لگے تو؟''

''تو تم بھی انھیں تنگ کرنا، نامیکی۔''

''اور اگر وہ ہم سے زیادہ طاقتور ہوئے تو؟''

''بزدل کہیں کے! پھر تم زور زور سے آوازیں نکالنا۔''

''وہ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔''

''مذاق تو اڑائیں گے ہی۔ تمھاری آوازیں سن کر میں اوپر والی کھڑکی سے جھانک کر دیکھوں گی اور ہنس ہنس کر تالیاں بجاؤں گی۔''

''کیا آپ کو پارٹی والے کمرے سے ساحل نظر آ جائے گا؟''

''ہاں، میرا خیال ہے نظر آ جائے گا۔''

''کیا آپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی رہیں گی؟''

''ٹھیک ہے، میں دیکھ کر ہاتھ ہلاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر تو انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم مسز اوئیشی کے بیٹے ہیں، اور وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

اپنے بیٹے کے منہ سے اپنا نام ''مسز اوئیشی'' سن کر ان کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اوہو، تم مجھے مسز اوئیشی کہتے ہو؟'' وہ اسے بتاتے بتاتے رہ گئیں کہ راس کے گاؤں میں بچوں نے ان کا نام مسز روہانسو رکھ دیا ہے۔ انھوں نے خود کو روک لیا۔ اب وہ اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں لڑکوں کو پہاڑی پر چڑھ کر مندر کی طرف جانا تھا۔ کوئی بیس گز جانے کے بعد دائے کیچی نے پکار کر پوچھا: ''امّی، اگر بارش ہوگئی تو ہم کیا کریں گے؟''

''احمق لڑکے! خود سوچو کہ کیا کرنا چاہیے۔''

ریستوراں وہاں سے دس منٹ سے کم کے راستے پر تھا۔ سیدھے اس سمت میں جاتے ہوئے مسز اوئیشی نے دیکھا کہ سانائے اور میسا کو بچوں کی طرح اُن کی طرف دوڑی

MashalBooks.com

چلی آ رہی ہیں۔

''مسز اوئیشی!'' ٹھیک طرح سلام دعا کیے بغیر وہ دونوں طرف سے استانی سے چمٹ گئیں۔

''ایک ایسی ہستی بھی آئی ہے جسے آپ نے بڑی مدّت سے نہیں دیکھا ہے۔ بوجھیے کون؟'' سانائے بولی۔

''کوئی ایسا جسے میں نے بڑی مدّت سے نہیں دیکھا؟''

''اگر آپ نے پہلی ہی دفعہ بوجھ لیا تو آج کے بعد ہم آپ پر پورا بھروسہ کیا کریں گے۔ ہے نا میسا کو؟'' سانائے اور میسا کو نے شرارت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

''مجھے ڈراؤ مت۔ تمھارے مجھ پر بھروسا کرنے کا فیصلہ اس بات پر ہوگا؟ اچھا، مجھے ذرا سوچنے دو..... کوئی ایسا جسے میں نے بڑی مدّت سے نہیں دیکھا ہے؟..... ارے ہاں، میں سمجھ گئی۔ ایک نہیں، دو ہوں گی: فوجیکو اور ماتچان؟''

''افوہ، اب میں کیا کروں؟'' سانائے بچوں کی طرح چلّائی۔

''میں نے صحیح بوجھا؟ کیا دونوں آئی ہیں؟''

''نہیں، دونوں نہیں۔ صرف ایک آئی ہے۔ بوجھیے کون؟ اب تو آپ بوجھ ہی لیں گی۔ سامنے ہی تو ہے۔''

وہ ریستوراں تک پہنچ چکی تھیں۔ ہال میں باقی سب کلاس کے ساتھ قطار بنائے کھڑے تھے اور کوتسورو اور ماسونو ان کے بیچ میں تھیں۔ شاید وہ سب ان تینوں کو آتا دیکھ رہے تھے۔ مسز اوئیشی کو تعجب ہوا کہ ایسو کیچی بھی گہرے رنگ کا چشمہ لگائے وہاں موجود تھا۔ ٹھیک اسی لمحے ایک عورت ان کے کندھے سے چمٹ گئی اور آنسوؤں سے رونے لگی۔ یہ وہ تھی جس نے بڑا خوش وضع کیمونو پہن رکھا تھا اور ماسونو کے برابر کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کہے: ''میں ماتسوئے ہوں، استانی صاحبہ!''، مسز اوئیشی نے اسے پہچان لیا۔

''افوہ، تمھیں تو ہو جسے میں نے بڑی مدّت سے نہیں دیکھا۔ تمھیں دوبارہ دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے، ماتچان! کتنی خوشی کی بات ہے۔ تمھارا شکریہ کہ تم آ گئیں۔''

ماتسوئے نے سسکیاں بھرتے ہوئے جواب دیا: ''مجھے ماسونو کا خط ملا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ موقع نکل گیا تو مجھے ساری زندگی کوئی نہیں پوچھے گا۔ اس لیے میں نے

اپنی شرم کو ایک طرف رکھا اور سیدھی یہاں چلی آئی۔ مسز اوئیشی، مجھے معاف کر دیجیے۔''
اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس پر ماسونو نے خوش دلی کے ساتھ اس کی گردن کے بال پکڑے اور بولیں: ''سنو ماتچان، ہم سب کی استانی پر اکیلے قبضہ مت جماؤ۔ چلو اب رونا دھونا بند کرو، اوپر چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟''

مسز اوئیشی کی توقع کے مطابق انھیں اوپر کی منزل پر سمندر کے سامنے والے کمرے میں جانا تھا۔

''ہیلو سونکی،'' انھوں نے ایسوکیچی کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ اوپر لے جانا چاہا۔

''اوہ مسز اوئیشی، کتنا عرصہ ہو گیا ہماری ملاقات کو!''

''ہاں، سات سال۔''

''سات سال! مجھ میں بہت تبدیلی آ گئی ہے،'' ایسوکیچی اپنے دونوں ہاتھ نیچے کیے ساکت کھڑا رہا، مگر پھر بے اختیار استانی کے ساتھ ساتھ اوپر جانے لگا۔ انھوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

آسمان پر سے بادل تھوڑے بہت چھٹ گئے تے اور دوپہر کا سورج نیچے سمندر پر خوب چمک رہا تھا۔ اس طرف خوب تیز روشنی تھی، لیکن عجیب بات ہے کہ شمال کی پہاڑی کی طرف والی کھڑکی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کسی بھی لمحے بارش ہونے لگے گی۔ لیکن آٹھ آٹھ افراد کے کھانے کے دونوں کمرے، جو ایک دوسرے سے ملحق تھے، تازہ ہوا سے بھرے ہوئے تھے جو بدن کی جِلد کے مساموں کو فرحت بخش رہے تھے۔

''اف، کیسا شاندار منظر ہے! ذرا دیکھو تو.....'' کوتسورو نے زینے کا جنگلا تھام کر پیچھے مڑے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا، مگر پھر فوراً ہی اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور خاموش ہو گئی کیوں کہ اس کی نظر ایسوکیچی پر پڑ گئی تھی۔ ماحول کے تناؤ کو ختم کرنے کے لیے ماسونو فوراً اپنی خوب صورت آواز میں بولی:

''مسز اوئیشی، آپ یہاں آ جایئے۔ سونکی کے برابر میں بیٹھیے۔ ماتچان، تم اس طرف بیٹھ جاؤ۔ سونکی اور ماتچان، تم دونوں مسز اوئیشی سے جی بھر کر باتیں کرو۔ باقی سب لوگ جہاں چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔'' ماسونو خاصے بے پروائی کے لہجے میں بول رہی تھی، مگر مسز اوئیشی اس کے اس انتظام میں چھپی گہری دردمندی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

MashalBooks.com

''ہماری خواہش تھی کہ اس پارٹی میں سارے ساتھی شریک ہوں۔ اس لیے.....'' اتنا کہہ کر ماسونو نے جلدی سے ایسوکیچی کی طرف نظر ڈالی اور اپنی انگلی سے کارنس کی طرف اشارہ کیا جہاں صنوبر کے نیچے کھنچوائی ہوئی یادگار تصویر پوسٹ کارڈ سائز فریم میں لکڑی کے تراشیدہ بیل سے ٹِک ہوئی تھی۔

سانائے نے ایک مختصر رسمی تقریر کر کے پارٹی کا آغاز کیا۔ ماسونو ایک بار پھر ماسونو نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا: ''اب ہم سب کو اسی طرح بے تکلف ہو جانا چاہیے جیسے ہم پہلی کلاس کے بچے ہوں۔ کیا خیال ہے، سونکی؟''

ایسوکیچی جو بالکل سیدھا تن کر بیٹھا تھا، ہاتھوں سے اپنے گھٹنے سہلانے لگا اور مسکرا دیا۔ ماتسوئے جو بڑی بے چینی سے مسز اوئیشی سے کچھ دیر بات کرنے کے موقعے کے انتظار میں تھی، انکے پاس سرک آئی اور ان کے چہرے پر نظر جما کر بولی: ''مجھے بہت خوشی ہے کہ جیسا تو آپ کی کلاس میں ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ جب مجھے معلوم ہوا تو میں کس قدر خوش ہوئی۔ میں اپنے ماضی پر اتنی شرمندہ ہوں کہ مجھ سے آپ کے سامنے اس طرح بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔ لیکن چاہے آپ مجھے کتنی ہی ملامت کرتی رہی ہوں، میں نے آپ کو کبھی نہیں بھلایا۔ میں نے آج تک آپ کے دیے ہوئے کھانے کے ڈبے کو سنبھال کر رکھا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی آنکھوں کو رومال سے ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر ماسونو نے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا شکایتیں کر رہی ہو ماتچان؟ تم نے اب تک ساکے کو چکھا تک نہیں۔ اب شکوہ شکایت بند کرو۔ تمھیں مسز اوئیشی سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں۔ کچھ پُرانے اچھے دنوں کی بات کرو!'' اس نے ماتسوئے کے کاندھے پر تھپکی دی۔ ماتسوئے نے اس کی بات کو سنجیدگی سے لیا، مگر مسرور لہجے میں جواب دیا: ''وہی تو کر رہی ہوں۔ ہے نا مسز اوئیشی؟ جنگ کے دنوں میں مَیں اس ڈبے کو اپنے ساتھ ہوائی حملے سے بچاؤ کی خندق میں بھی لے جاتی تھی۔ میں اپنی بیٹی تک کو اسے چھونے نہیں دیتی ہوں۔ یہ میرا خزانہ ہے۔ میں آج بھی اپنے لیے اس میں چاول رکھ کر لائی ہوں۔''

یہ سن کر کیچی جی بڑبڑایا: ''اس پر یاد آیا،'' اور اس نے اپنی خاکی جوڑے کی جیب میں سے کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔ ''یہ رہے میرے چاول۔'' یہ کہہ کر اس نے تھیلی ماسونو کے حوالے کر دی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی کچن! تم تو ہمارے لیے مچھلی لائے تھے۔''

MashalBooks.com

لگتا ہے ان میں سے ہر ایک نے پارٹی میں کچھ نہ کچھ حصّہ ڈالا ہے، مسز اوئیشی نے سوچا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ماتسوئے کی بات سننے کے لیے بے چین تھیں، کیوں کہ انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ وہ کس ڈبے کی بات کر رہی ہے۔ یہ کون سا قیمتی کھانے کا ڈبا تھا جسے وہ ہوائی حملوں تک سے بچاتی رہی تھی؟ انھوں نے خود سے سوال کیا۔ وہ کنول کے پھول والے کھانے کے ڈبے کو قطعی فراموش کر چکی تھیں۔

''کون سا ڈبا، ماتچان؟'' انھوں نے دبی آواز میں پوچھا۔

ماتسوئے چلّا اٹھی: ''آپ کو یاد نہیں؟ اچھا، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' وہ گونجتے ہوئے قدموں کے ساتھ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے گئی اور فوراً لپکتی ہوئی واپس آئی۔ پھر وہ اپنا خالی ڈبا سب کو دکھاتے ہوئے بولی: ''دیکھو، یہ ڈبا مجھے مسز اوئیشی نے دیا تھا جب میں پانچویں کلاس میں تھی۔ کیسا ہے؟''

سب ہنسنے لگے۔ ''مجھے آپ سے شکایت ہے، مسز اوئیشی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ماتچان پر اتنی مہربان ہیں۔ مجھے سچ مچ نہیں معلوم تھا،'' ماسونو نے احتجاج کیا، جس پر ایک بار پھر قہقہے بلند ہوئے۔ مگر مسز اوئیشی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

انھوں نے کھانے کے ڈبے کو فوراً پہنچان لیا۔ انھیں یاد آ گیا کہ ماتسوئے کو یہ ڈبا لے کر اسکول آنے کا ایک بار بھی موقع نہیں ملا تھا۔ انھیں یہ بھی یاد آیا کہ اسکول کے بچوں کی سیر کے دوران ماتسوئے انھیں بندرگاہ کے پاس والے چھوٹے سے ریستوراں میں ''ایک تامپورا!'' کی آوازیں لگاتی نظر آئی تھی۔ ماتسوئے کے گزرے ہوئے دنوں کی یہ سب یادیں مسز اوئیشی کے ذہن میں تازہ ہو گئیں، اور ان کا تعلق سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے بالکل واضح ہو گیا۔ بے چاری ماتسوئے، مسز اوئیشی نے سوچا۔ اسے کتنی بدقسمتیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور وہ اپنے آپ پر اتنی شرمندہ ہے جیسے یہ سب اسی کا قصور ہو۔

کھانا لگایا جانے لگا اور ماتسوئے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بیئر کی بوتلیں اور دوسرے مشروب لے لے کر اِدھر اُدھر جانے لگی اور مہارت سے گلاس بھرنے لگی۔ کھانے کی تیاری پر نظر ڈال کر ماسونو نے تجویز پیش کی: ''آؤ، اب استانی صاحبہ کی صحت کا جام پییں!'' ماسونو نے اپنا گلاس سب سے پہلے خالی کر دیا۔ جب ماتسوئے نے اس کا گلاس دوبارہ بھرا تو وہ بھی اس نے فوراً پی لیا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا: ''کاش نیتا اور تانکو بھی آج یہاں موجود ہوتے۔ پھر کوئی کمی نہ رہتی۔ کیوں، ٹھیک ہے نا

مسز اوئیشی؟ سونکی، تانکو، کِچن، نِیتا..... سب کتنے اچھے دل کے تھے۔ اور تاکے ایچی.....بس، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ تھوڑا سا مغرور ہو گیا تھا، مگر بہر حال، وہ بھی بڑا اچھا لڑکا تھا۔ ہماری کلاس میں سبھی اچھے تھے، ہے نا مسز اوئیشی؟ مگر سب لڑکے بد قسمت رہے، اور لڑکیاں سخت جان نکلیں۔ کوتسورو اور سانائے بھی، مگر شاید ماتسوئے اور میں سب سے زیادہ سخت جان ہیں۔ مگر ہمارا دل اب تک نرم ہے۔ میرا خیال ہے جن تجربات سے ہم دونوں کو گزرنا پڑا انھوں نے ہمیں سمجھ دار بنا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے ہم وہ کچھ کر سکتے ہیں جو شادی شدہ خواتین، مثلاً مائیسان، اور باوقار کنواریاں، مثلاً کوتسورو، کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔ ٹھیک ہے نا، ماتچان؟ آؤ، اب ہم ان کے سامنے اپنے حوصلے کا مظاہرہ کریں!''

اس نے ماتسوئے کے گلاس میں بیئر ڈالی۔ سب عورتوں میں صرف وہی دونوں بیئر پی رہی تھیں۔ کوتسورو پارٹی شروع ہونے کے وقت سے ایسوکیچی کے برابر میں بیٹھی ہوئی اسے کھانا نکال نکال کر دے رہی تھی۔ ماتسوئے کھانا لانے لے جانے میں مصروف تھی، کبھی کھڑی ہوتی، کبھی بیٹھ جاتی، جیسے یہ اس کی ملازمت کی جگہ ہو۔ کیچی جی ہمیشہ کی طرح خاموش بیٹھا تھا اور صرف کھانے پینے میں مشغول تھا۔ اس کے برابر میں بیٹھی سانائے ہنستے ہوئے مسز اوئیشی سے بولی: ''مسز اوئیشی، آپ کا کیا خیال ہے، ایسی پارٹیوں میں استانیاں سب سے بے کار فرد ہوتی ہیں؟'' پھر وہ کندھے اچکا کر کھلکھلانے لگی۔

''سب سے نکمی تو میں ہوں،'' میساکو نے شرماتے ہوئے کہا، جس پر سب زور سے ہنس پڑے۔

ماسونو، جس پر پینے کا اثر ظاہر ہونے لگا تھا، ایسوکیچی کی طرف بڑھی اور اس کا گلاس اس کے ہاتھ میں مضبوطی سے تھما دیا۔ ''سونکی، اب میں مستقبل کے ماہر مساج کرنے والے کے لیے ایک گلاس بیئر اور نکالتی ہوں۔''

مسز اوئیشی کو احساس ہوا کہ جب سے پارٹی شروع ہوئی ہے، ایسوکیچی بالکل تنا ہوا بیٹھا ہے اور اس نے ایک لمحے کو بھی خود کو ڈھیلا نہیں چھوڑا۔ ''ہم سب آرام سے بیٹھے ہیں، سونکی،'' وہ بولیں۔ ''تم بھی آرام سے کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟''

اس نے اپنا سر تھوڑا سا ایک طرف خم کیا اور اپنی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھتے

ہوئے جواب دیا: ''سچ بات یہ ہے مسز اوئیشی، کہ مجھے اس طرح بیٹھنے میں زیادہ آرام ملتا ہے۔'' شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکپن ہی سے، جب اسے پرانی چیزوں کی عادت ہوگئی تھی۔ اب، تقریباً پچیس برس کی عمر میں، اسے ایک نیا ہنر سیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس پکی عمر کو پہنچ جانے کے بعد یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اس کام میں مہارت حاصل کر پائے گا یا نہیں۔ لیکن اس کے لیے زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس کا استاد عموماً ایسے شاگردوں کو نہیں لیتا تھا، لیکن ماسونو کے اصرار پر وہ آخر کار اس کا شاگرد بن گیا تھا۔

ماسونو اس سے یوں بات کر رہی تھی جیسے وہ اس کا چھوٹا بھائی ہو۔ ''چوں کہ تمھاری بینائی ضائع ہوگئی ہے، اس لیے سب لوگ تم سے ہمدردی رکھتے ہیں اور احتیاط کرتے ہیں کہ تمھیں اس کا احساس نہ دلائیں۔ لیکن تمھیں دل چھوٹا کرنے کی قطعی ضرورت نہیں، سونکی۔ اگر لوگ تمھیں اندھا کہنے بھی لگیں تو تمھیں ان کو نظر انداز کرنا سیکھ لینا چاہیے۔''

بیئر چھلک کر ایسوکیچی کی گود میں گر پڑی۔ اس نے جلدی سے اپنا گلاس خالی کر دیا۔ پھر وہ اسے ماسونو کو لوٹاتے ہوئے کہنے لگا: ''ماسونو، اندھے کا لفظ اتنا زیادہ استعمال مت کرو۔ میں اسے اچھی طرح جان گیا ہوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تم سب لوگ میرے ساتھ اتنی زیادہ احتیاط نہ کیا کرو۔ تصویر کی بات کرنی ہو یا کوئی اَور بات ہو، کھل کر کرو۔''

سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنس دیے۔ اب جب ایسوکیچی نے تصویر کا ذکر چھیڑ ہی دیا تھا تو وہ کیوں کر اپنی جگہ رکھی رہ سکتی تھی۔ سب اسے ہاتھ میں لے کر باری باری دیکھنے لگے۔ ان میں ہر ایک اس پر کوئی عام سا تبصرہ کرتا اور آگے بڑھا دیتا۔ آخر میں تصویر کوتسورو کے پاس پہنچی جس نے ذرا بھی ہچکچائے بغیر اسے ایسوکیچی کو تھما دیا اور بولی: ''یہ رہی صنوبر کے پیڑ والی تصویر۔''

غالباً شراب کے اثر سے ایسوکیچی نے اپنی آنکھیں سیدھی تصویر پر گاڑ دیں جس سے یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ واقعی اسے دیکھ سکتا ہے۔ یہ احساس ہونے پر کیچی جی نے، جو اس کے برابر میں بیٹھا تھا، حیران ہو کر پوچھا، جیسے اس پر ابھی ابھی کسی انوکھی بات کا انکشاف ہوا ہو: ''کیا تم تھوڑا دیکھ لیتے ہو، سونکی؟''

ایسوکیچی یہ سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا: ''میری آنکھیں نہیں ہیں، کچن۔ مگر یہ تصویر

میں یقیناً دیکھ سکتا ہوں۔ دیکھو، یہ سب کے بیچ میں مسز اوئیشی کے داہنے ہاتھ پر ہے اور فوجیکو بائیں ہاتھ پر۔ ماتچان نے ہاتھ باندھ رکھے ہیں اور اپنی چھوٹی انگلی باہر نکال رکھی ہے۔ اور.....'' وہ قطار میں کھڑے ہر بچے کے بارے میں پورے اعتماد سے بتا تا رہا، لیکن اس کی انگلی ہر بار درست جگہ سے ذرا دور رہتی تھی۔

کیچی جی کو جواب دینے میں ہچکچاتا دیکھ کر ہر بار مسز اوئیشی کہتیں: ''بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک!''

وہ مسرور آواز میں اس کی تائید کرتی جا رہی تھیں اور آنسوان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ سب پر چھائی خاموشی کے درمیان سانائے اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ماسونو نے، جواب کچھ سُرور میں آ گئی تھی، جنگلے سے ٹیک لگا کر گانا شروع کر دیا:

''وہ قلعہ کھنڈر ہو گیا
جہاں سور ماسکون سے
چاندنی میں بیٹھ کر
ساکے کے جام گردش میں لاتے تھے
اور چیری کے پیڑ
پھولوں سے لدے رہتے تھے۔''

وہ اپنی آنکھیں بند کیے گاتی رہی جیسے اپنی ہی حسین آواز سے مسحور ہو گئی ہو۔ یہ وہی گیت تھا جو اس نے چھٹی کلاس میں اسکول کی تقریب کے آخری نغمے کے طور پر پیش کیا تھا، اور جس سے اسے اس قدر مقبولیت ملی تھی۔ سانائے اچانک اس کے کندھے سے لپٹ گئی اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔

MashalBooks.com

MashalBooks.com